دو سفر
محمد خالد اختر

دو سفر

(سفرنامہ)

محمد خالد اختر

سواتی مہم

''ہم تم لوگوں کو سیدو سے تار دیں گے۔ پرسوں شام کو ہم سیدو کے کوچوں میں گھوم رہے ہوں گے۔ ہم نے خیبر میل کی ریستوران کار میں پھلا نگتے ہوئے پیٹر اور ہربرٹ سپنسر کو تنبیہ کی۔

پیٹر اور ہربرٹ ہمیں میل پر چڑھانے کے لیے آئے تھے۔ وہ ہمیں قدرے بجھے بجھے سے رشک کے احساس سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے انہیں یقین تھا کہ ہم ان کو بنا رہے ہیں اور سیدو نہیں پہنچ سکیں گے۔

وہ ہمارے ساتھ چلتے لیکن اس وقت شاعر اور فلسفی دونوں دیوالئے تھے۔ ہم نے اپنے خرچ پر انہیں ہمراہ لے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا جس سے ان کے دلوں کو صدمہ پہنچا تھا۔ پھر ہربرٹ کو ایک ضروری کام بھی تو تھا۔ اس نے اپنے کہنے کے مطابق ایک پولیس کانسٹیبل دوست کی مدد سے اپنے چند قرضداروں سے روپے وصول کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ اس نے اخلاقی سہارے کے لیے اس مشن پر پیٹر کو بھی گاؤں میں ساتھ چلنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ پیٹر نے از راہ اخلاص اس دعوت کو مجبوراً قبول کر لیا تھا۔ ہربرٹ کی رائے میں پیٹر کو روپے کی وصولیاں کرانے میں خاص ملکہ حاصل ہے ویسے پیٹر کی اس شہرت کی اصلاً کوئی بنیاد نہیں۔

''روپے وصول کر لینے دو'' ہربرٹ نے حسرت نکالتے ہوئے ہم سے کہا ''ہم بھی پھر سیدھے سیدو شریف پہنچ کر دم لیں گے...... ہم سوات ہوٹل میں ٹھہریں گے۔''

سیدو شریف! نام میں ہی کتنا طلسم تھا۔ زمردیں پہاڑوں کے بیچ میں پڑا ہوا ننھا کوہستانی شہر ہماری تخیل کی آنکھوں کے سامنے ابھرا تشیلی کہن سالہ ے کی طرح یہ نام دماغ کو چڑھتا تھا۔ ''سیدو!'' ''سیدو!'' اس نام سے کس آدمی کا دل بھر سکتا تھا۔ ''سیدو!'' ''سیدو!'' اتنا دور اور ناممکن الحصول جتنا لاہسا یا تاشقند یا بخارا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی وہاں پہنچ سکنے کا یقین نہ تھا۔ ایسی اچھی قسمت ہماری کہاں ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم اپنے پژمردہ دلوں کو رومانیت سے جگمگانے کی خاطر' اپنے دوستوں کی چھیڑ کی خاطر بار بار ''سیدو'' کا نام لیتے تھے۔ سیدو شریف اس وقت ہمارے لیے ایسا ہی تھا جیسا کارٹز کے ہسپانوی البیلوں کے لیے سحر انگیز ایل دوریدو۔ سونے اشرفیوں اور آبدار لعلوں کا شہر جہاں پہنچنے کے لیے انسانوں کے ماندہ قدم سدا سرگرم راہ رہتے ہیں اور جس تک پہنچنا کسی کے مقسوم میں نہیں۔

خیبر میل کے ساتھ اس روز وہ چھوٹا نا ٹا سا گارڈ تھا۔ وہ گویا کلف سے اکڑا ہوا تھا۔ چھڑی کی طرح۔ ہمیں اس بونے گارڈ سے محبت تھی۔ وہ ان گارڈوں میں سے ایک ہے جو سیٹیاں بجانے اور سبز اور لال جھنڈیاں ہلانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کی سب سے خوبصورت ایجاد ہیں۔

''وہی اسمارٹ گارڈ ہے۔'' اپی کیورس نے خوشی اور طمانیت سے گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم خوش قسمت ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

گارڈ نے پہلے ایک چھوٹے بچے کی طرح ایک تیز خوش کن سیٹی بجائی۔ پھر شوخی اور فخر سے اپنی سبز جھنڈی ہلائی اور اپنے ڈبے میں بڑی صفائی سے پھدک کر چڑھ گیا۔ اس کی حرکات میں ایک کٹھ پتلی کی سی سختی اور صفائی تھی جو آدمی کو حیران کر دیتی تھی...... ڈیزل خرخرانے اور دھڑکنے لگا۔ اس نے ایک مختصر تشنہ ہانک لگائی اور پر جوش الوداعی ہاتھوں کے لہرانے کے درمیان ہم حرکت کرنے لگے ...... سیدو شریف کی سمت! دھوپ میں جلتے ہوئے پلیٹ فارم پر پیٹر اور ہربرٹ کی شکلیں اکیلی اور کھوئی سی لگتی تھیں۔

ریستوراں کار کے ٹھنڈے' چوکھٹے' لگے' پرسکون جھٹپٹے میں بیٹھے ہوئے ہم دھڑکتے دلوں سے پیلے کھیتوں اور کھجور کے درختوں کو گزرتے دیکھنے لگے۔ پنکھے اوپر پھڑ پھڑا رہے تھے اور لکڑی کے چوکھٹوں کا نیا پالش امریکن میگزینوں میں بڑھیا دھسکی کے اشتہاروں کی سی جھلک دیتا تھا۔ پالش بادۂ احمریں کی رنگت کا تھا! ہم نے اپنے آپ کو نواب محسوس کیا۔

ہم نے سگرٹ پیئے۔ ہم نے ڈیزل الیکٹرک انجنوں اور اسٹیم انجنوں کی نسبتی خوبیوں کا مقابلہ کیا۔ اپی کیورس نے سٹیم انجنوں کو بے حد سراہا۔ اس کی رائے میں سٹیم انجن ایک اصلی ایماندار ریل کا انجن تھا...... بھاپ کی طاقت کا عنصری سمبل۔ اس نے ڈیزل کا مذاق اڑایا۔ ''یہ بس کی طرح لگتا ہے۔ اصل انجن کی طرح ذرہ بھر بھی نہیں'' اس نے کہا گفتگو کی خاطر میں نے ڈیزل انجنوں کی حمایت کی۔

لودھراں پر لنچ سرو کیا گیا۔ لنچ اچھا اور لذیذ تھا اور ایسا لگتا تھا اس کے کورس ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔ اپنے معدے میں ہضم کرنے والے کیمیاوی رسوں کی کمی وجہ سے میں ہمیشہ شرم اور ملزمی کے احساس کے ساتھ کھاتا ہوں۔ میں نے ایک دو کورس سکپ کیے۔ اپی کیورس نے لنچ کو ایک سچے گورمے کے لطف سے کھایا اور مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے ایک بھرے ہوئے کورس سے دوسرے بھرے ہوئے کورس تک گزرتا رہا۔ فرائڈ فش اور پلاؤ کی اس نے دو دو ہیلپنگ لیں۔ میں نے اسے رشک کے جذبات سے دیکھا۔ ریستوراں کار کا سٹاف بھی اسے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ بیرے اس کے اشاروں پر بھاگنے لگے' جیسے وہ کوئی ڈیوک

ہو۔ مجھے انہوں نے غالباً ڈیوک کا کوئی فاقہ مست ''ہینگر آن'' دوست سمجھا۔

''بھئی بے تحاشا کھانا کھالیا ہے۔'' اپی کیورس نے آئس کریم کی دوسری ہیلنگ کو ختم کرتے ہوئے کہا ''اب میٹھی کافی مل جائے تو جیون سپھل ہو جائے۔''

ریستوراں کاروں میں وہ تمہیں کافی سرو کرتے ہیں' کافی سرو کی گئی اپی کیورس نے مجھے ایک سگرٹ پینے کے لیے دیا۔ (یہ جانتے ہوئے کہ زیادہ سگرٹ میرے لیے اچھے نہیں۔ اپی کیورس میری اپنی خواہش کے مطابق میرے سگرٹوں پر کنٹرول کر رہا تھا۔) ہم نے لاہور تک بورژوا آرام میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا لاہور تک ہمیں اپنے خاکی جسموں کو پوری طرح لاڈ پیار سے بگاڑنے کی اجازت تھی۔ اس سے آگے ہمیں انٹر یا تھرڈ میں جانا تھا اور اصلی ''ویگا بانڈز'' کی طرح سفر کرنا تھا...... کافی ختم کرتے کرتے گاڑی ملتان سٹیشن کی حدود میں داخل ہو چکی تھی...... چھاؤنی کا قلعہ جدا ہوتی اور آ کر ملتی ہوئی یارڈ کی لائنیں اور نیلی منقش محرابوں والا ریلوے اسٹیشن' ہم گویا بھٹک کر ریلوے اسٹیشن کی بجائے کسی بڑے ولی کے مزار میں گھس آئے تھے۔ ملتان اسٹیشن' اسٹیشن سے زیادہ ایک درگاہ کی طرح لگتا ہے' جیسے ریلوے کے معماروں نے اسٹیشن بنانے کی نیت سے کام شروع کیا ہو اور اس کی بجائے ایک مزار تعمیر کر ڈالا ہو اور جب انہیں اس کا احساس ہوا ہو تو وہ اس کے متعلق کچھ نہ کر سکے ہوں۔ یہ یقیناً چند شریر جنات کی کارستانی تھی جو معماروں کے ڈیزائن کو بدل کر ان کا تماشا بناتے رہے تھے...... ہم پر اس وقت تک واضح طور پر نیند اور غنودگی کی کیفیات طاری ہو چکی تھیں۔ ہمارے اعضا پھیلنے کے آرزومند تھے۔ بک سٹال پر ایک نظر ڈال کر ہم اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بھاگے۔ اپی کیورس نے جلدی سے دونوں بستر کھول کر ایک کو نچلی نشست پر اور دوسری کو اوپر کی نشست پر بچھا دیا۔ ہم لیٹ گئے۔ کمپارٹمنٹ میں محبوس گرمی تھی۔ مجھے تو نیند کچھ یونہی سی آئی مگر اپی کیورس صحیح معنوں میں گھوڑے بیچ کر سویا۔ وہ پورے پانچ بجے تک سویا رہا۔

منٹگمری پر میں نے اسے تیسری بار جگایا۔ ''بھئی اپی کیورس' اٹھو' ریستوراں کار میں چل کر چائے وغیرہ پئیں۔'' میں نے کہا۔ وہ بڑی عدم الفرصتی کے موڈ میں اٹھا۔ اتنے میں میں نے کھڑکی میں سے پلیٹ فارم پر مجمع میں چند بسنتی اور پیلی خالصی پگڑیاں اچھلتی دیکھیں۔

''مائی گاڈ' اپی کیورس'' میں چلائے بغیر نہ رہ سکا ''یہاں تو سکھ ہیں...... اٹھو انہیں دیکھیں۔'' ہماری پچھلی سات سالہ زندگی میں یہ پہلے سکھ تھے۔ ہمارا اضطراب با آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ہماری آنکھیں انہیں دیکھنے کے لیے ترس گئی تھیں اور ہم انہیں کسی قیمت پر ''مس'' کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جلدی سے تیار ہو کر ہم پلیٹ فارم پر ریستوران کار کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ منٹگمری

کے لمبے فراخ پلیٹ فارم پر مسافروں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ سکھ یکدم غائب ہو چکے تھے۔

''تمہیں یقین ہے کہ تم نے واقعی سکھ دیکھے تھے۔'' اپی کیورس نے پوچھا۔

'' تھے تو سکھ ہی'' میں اب کچھ شک میں پڑ گیا۔

دفعتاً ہم نے انہیں آتے دیکھا۔ وہ تین سکھ تھے...... ایک پینتیس سال کا چھریرا لانبا نوجوان تھا۔ دوسرا ابھرے اور گٹھے جسم کا تھا۔ تیسرا سلونی رنگت کا مضبوط گھبرا لڑکا تھا جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ پہلا سکھ اپنے فاختی سوٹ اور بھڑکیلی ٹائی میں کسی قدر ایک ڈینڈی' لگتا تھا...... مگر وہ ایک معصوم طریق پر ڈینڈی' تھا۔ اور اس کی سج دھج ایک ایسا کامک تاثر دیتی تھی کہ اسے پسند کیے بغیر چارہ نہ تھا...... وہ تینوں سخت بدحواس ہو رہے تھے...... پتلا سکھ سب سے زیادہ...... اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے پلیٹ فارم پر ایک ایسی رفتار سے چل رہے تھے جو چلنے اور بھاگنے کے بین بین تھی۔ ان کا ایک چوتھا ساتھی بھی تھا۔ ایک شوخ' خوشگوار چہرے والا مسلمان' اور وہ چاروں گاڑی میں جگہ ڈھونڈ رہے تھے'' آؤ! سردار جی۔ اینتھے ریستوراں کار وچ ای چڑھ چلیئے۔'' مسلمان ساتھی نے تجویز پیش کی۔

''نہیں جی۔ ریستوراں کار وچ کی بیٹھنا اے'' لانبے سکھ نے کچھ سوچ کر کہا اور وہ چاروں تیز تیز قدم چلتے اور بھرے کمپارٹمنٹوں میں جھانکتے آگے نکل گئے۔ وہ پھر واپس آئے۔

انہیں ابھی جگہ نہ ملی تھی...... گارڈ نے وِسل دے دی تھی اور گاڑی چلنے والی تھی۔ مجبوراً وہ کسی قدر ہچکچاہٹ سے ریستوراں کار میں چڑھ آئے۔ ان کی ہچکچاہٹ اس لیے تھی کہ ان کے پاس انٹر کلاس کے ٹکٹ تھے اور جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے ریستوراں کار میں صرف اونچے درجے کے لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔

اپی کیورس نے چائے پینے سے پہلے لیمونیڈ کے ساتھ سکوائش کا آرڈر دیا۔ اسے سرکتے ہوئے ہم اپنے سکھوں کو استعجاب اور اشتیاق سے دیکھنے لگے۔ وہ ہمیں اکزاٹک (Cxotic) لگ رہے تھے۔ وہ پاکستان میں تھے۔ اس لیے بچوں کی طرح مضطرب اور خوش تھے۔ پتلا سکھ اپنے ساتھیوں سے کبھی انگریزی اور کبھی پنجابی میں ایک اونچے اور خود آگاہ انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ انگریزی بولنے کا زیادہ مشتاق تھا اور اس کے الفاظ محض اپنے ساتھیوں کے کانوں کے لیے ہی نہ تھے۔ وہ بالواسطہ ہمیں سنا رہا تھا اور باتوں کے درمیان وہ ہماری طرف بار بار نظر ڈالتا۔

ایک ٹکٹ چیکر ان کے پیچھے ہی کار میں چڑھ آیا۔ وہ ایک میلے چہرے کا سوکھا سڑا شخص تھا۔ میرا خیال ہے وہ ایسی چیزیں کھاتا تھا

جو اسے راس نہ آتی تھیں۔ اس کا چہرہ بے حد زرد' غیر صحت مندانہ تھا اور اپنی سفید ریلوے کی یونیفارم میں وہ ایک چھپکلے کی یاد دلاتا تھا۔

یہ جانتے ہوئے کہ سکھوں کے پاس انٹر کلاس کے ٹکٹ ہیں۔ اس نے ارادتاً ٹکٹ چیک کرنے شروع کر دیئے ''سردار جی۔ ٹکٹ دکھاؤ۔''

سرداروں نے کچھ جھینپ کر اپنے انٹر کلاس کے ٹکٹ نکالے اور خاموشی سے انہیں ٹکٹ چیکر کی طرف بڑھایا۔ ''یہ انٹر کلاس کے ٹکٹ ہیں۔'' چھپکلے نے ایک اہم انداز میں کہا '' آپ سے سکینڈ کلاس کا کرایہ چارج کیا جائے گا......''

اب اس شخص کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سکھ کہیں اور جگہ نہ پا کر مجبوراً ریستوراں کار میں آ بیٹھے تھے اور وہ اس کے ملک میں ایک دو روز کے مہمان بن کر آئے تھے وہ ان کو نظر انداز کر سکتا تھا لیکن اس نے انہیں چارج کیا...... شوخ چہرے والے مسلمان دوست نے ٹکٹ چیکر کو چھیڑا ''بابو جی۔ بیٹھو تو سہی کتنے پیسے لینے اے او۔'' اس نے زائد کرایے کی رقم جیب سے نکال چیکر کو دی جو اپنی ٹکٹ کی کتاب نکال کر ٹکٹ بنانے لگا۔ ٹکٹ کاٹنے کے بعد وہ ایک ڈھیٹ چہرے کے ساتھ ہمارے مقابل کی میز پر آ بیٹھا اور اپنی جیب میں سے ایک کتاب نکال کر اسے گویا پڑھنے لگا۔ یہ رئیس احمد جعفری کا کوئی اسلامی تاریخی ناول تھا۔ اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ ایک بے حد گھٹیا چیز تھی۔ اور یہ کہ کار میں ہر شخص اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے کھسیانے پن کو رئیس احمد جعفری کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی...... لیکن شوخ چہرے والے مسلمان نے اسے بالکل امن میں نہ چھوڑا۔ وہ ایک بے دھڑک اور منہ پھٹ لاہوریا تھا اور راستے بھر وہ ٹکٹ چیکر سے پر مذاق چھیڑ کرتا رہا۔ اس کے جواب دھیمے اور بے جان سے ہوتے اور بولتے وقت اس کے چہرے پر اعصابی بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا تھا اسے کم از کم اپنے فعل کی کچھ سزا تو ملی' وہ بالکل امن میں تو نہ بیٹھا رہا۔ اس چیز نے مجھے بہت مسرت دی اور زندہ دل لاہوریا مجھے بڑا پیارا لگنے لگا۔

اب اگر تم ان گھٹے ہوئے فرض شناس مزاج کے لوگوں میں سے ہو تو شاید تم اس ٹکٹ چیکر کے رویے کی طرفداری میں یہ دلیل دو گے کہ اس نے ان لوگوں سے کرایہ چارج کر کے اپنا فرض ادا کیا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ اپنے فرض میں کوتاہی کا مجرم ہوتا۔ درست! مگر فرض کا بہت زیادہ احساس عموماً ایک غیر فیاض اور تنگ طبیعت کا آئینہ دار ہے۔ اور فرض سے زیادہ کئی اور چیزیں ایسی ہیں جو زیادہ ضروری ہوتی ہیں...... مثلاً انسانی رفاقت' شرافت' خوش اخلاقی' سچی ہمدردی۔ جہاں فرض کی بجا آوری سے ان سب چیزوں کا خون ہوتا ہو' وہاں بہتر ہو گا کہ تم ایسے فرض سے چشم پوشی کر لو۔ ہمارے اصول اتنے کڑے نہیں ہونے چاہئیں۔ وہ ہمارے ظالم آقا

نہیں کہ انہیں کبھی ڈھیل نہ دی جاسکے اور زندگی کا عمل اقلیدس کی چھیتسویں تھیورم نہیں ہے۔ اصول اور فرض اپنی جگہ اچھی چیزیں ہیں مگر وہ شخص جو کلیتاً اپنی زندگی کو ان کے مطابق چلاتا ہے میرا بھائی نہیں ہوسکتا...... اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ ٹکٹ چیکر احساس فرض کا اتنا عینی پیکر نہ تھا جتنا وہ بن رہا تھا۔ فرض کرو کہ ان سکھوں کی بجائے اگر اس کے اپنے دوست اس طرح بیٹھے ہوتے تو کیا اسے اپنا فرض یاد ہوتا...... اب بھی اس کے ساتھ ایک مستری قسم کا دوست بیٹھا ہوا تھا اس کے پاس یقیناً کسی کلاس کا ٹکٹ یا پاس نہیں تھا۔

لاہوریے نے چھیکلے کو زندہ دلی سے للکارا "باؤجی! ایہ بزرگ جہڑے تہاڈے نال بیٹھے نیں' انہاں دے کول تے سیکنڈ کلاس دا ٹکٹ ضرور ہووے گا۔"

"ان کے پاس ریلوے پاس ہے۔" چیکر نے لنگڑا جواب دیا۔

"اچھا' باؤجی خوش رہو۔" لاہوریے نے سارے ڈبے کو آنکھ مار کے اپنے مذاق میں شریک کرلیا۔ مگر اس واقعے کے کچھ دیر بعد تک ہمارے سرداروں کی ابلتی ہوئی "سپرٹس" پر اداس سی پڑی رہی۔ ان کی بے تکلفانہ' چہڑ چہڑ تقریباً بند ہوگئی...... انہیں شاید اپنے سفر میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ ایک غیر ملک میں اجنبی ہیں۔ کسی اور پر ان کے کرایوں کا بوجھ پڑا تھا' اس خیال نے بھی انہیں بجھا دیا......

ہم نے ایک اور لیمن اسکویش پیا۔ اس کے بعد اپی کیورس نے چائے کا آرڈ دیا (اپی کیورس حیاتی لذتوں کو زندگی میں مناسب جگہ دینے کے حق میں ہے۔ اس نے چار بڑے پیالے پئے اور بیرے کو چائے کا پاٹ دوبارہ لانا پڑا)...... میرے سب دوستوں میں سے اپی کیورس سے بڑھ کر اس خدائی پتی کا رسیا اور کوئی نہیں...... اس نے کبھی چائے کا ایک اور پیالا پینے سے انکار نہیں کیا۔ میں نے خود اسے ایک دفعہ تین گھنٹوں میں آنکھ جھپکے بغیر پچیس پیالے پیتے دیکھا ہے۔

میرا خیال ہے یہ اوکاڑا اسٹیشن تھا کہ ایفی شنٹ انسان کار کے اندر آیا۔ وہ ایک بڑا' دوہرے جسم کا آدمی تھا۔ اس کے سیاہ چمڑے کے کرخت نقوش کے چہرے پر جلی حروف میں "بزنس اگز کٹو" چھاپے کی طرح صاف لکھا ہوا تھا۔ وہ خود اعتمادی اور تحکمانہ صلاحیت کا مجسمہ تھا اس کی آواز پاٹ دار تھی...... ایسے شخص کی آواز جو حکم چلانا اپنا حق سمجھتا ہو۔

اس نے اندر آکر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کئی ایک میزیں خالی تھیں لیکن کسی وجہ سے وہ ہماری میز پر آبیٹھا......

"ویری ہاٹ" ایفی شنٹ آدمی نے کہا۔

اپی کیورس نے جواب دیا کہ موسم دو تین دن سے بدل گیا ہے۔

اس نے چہچہاتے ہوئے سکھوں کو ایک بڑھیا قسم کی تحقیر سے دیکھا ''سکھ بڑے ناٹری ہیں۔ انہیں مینرز نہیں آتے......''

اپی کیورس نے کہا ''سکھ ایک جوشیلی ہارٹی قوم ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسے تھے۔''

''مجھے خوش آیند شور برا نہیں لگتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ایفی شنٹ آدمی نے مجھے سرسری طور پر دیکھا۔ پھر جیسے اس نے فیصلہ کیا کہ میں کسی شمار میں نہیں۔ اس نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز ہی کر دیا۔

''بیرا' کافی لاؤ۔ آپ کافی پئیں گے۔'' اس نے اپی کیورس سے پوچھا۔

''اپی کیورس نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس نے اپی کیورس کو بتایا کہ وہ ایک فرم کا اگزکٹو ہے جو عمارتوں میں کام آنے والا ایک واٹر پروف پینٹ بناتی ہے۔ اس کا کارخانہ کراچی میں ہے اور وہ اب آرڈرز کے لیے اور کاروباری تعلقات پیدا کرنے کے لیے پنجاب اور فرنٹیئر کا ٹور کر رہا ہے۔ اپی کیورس خود ایک سول انجینئر ہے۔ اس نے واٹر پروف پینٹ میں دلچسپی ظاہر کی۔ گفتگو بے حد ٹیکنیکل ہوگئی۔ بزنس اگزکٹو اب اپنی زمین پر تھا۔ واٹر پروف پینٹ ہی شاید ایک ایسا موضوع تھا جس پر وہ پوری واقفیت اور فیصلہ کن طریقے سے گفتگو کر سکنے کا اہل تھا۔ اس کے نزدیک دنیا کی موجودہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا علاج اس کا واٹر پروف پینٹ تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ہمارے اور ہمارے انجینیرنگ ڈیپارٹمنٹ کے کئی افسروں کے پتے ڈائری میں نوٹ کرنے کے بعد ایفی شنٹ آدمی نے ہم سے اجازت چاہی...... یہ خود اعتماد دنیاوی آدمی کتنے قابل رشک ہیں۔ کاش ہم سب ان کی طرح ہو سکتے۔ سب انسان ان کے لیے بیرے ہیں۔ دنیا ان کے بھاری قدموں کے نیچے ہے۔ ان کے دماغ میں کوئی ایچ پیچ' کوئی بکواس نہیں۔ وہ صرف روزانہ پیپر پڑھتے ہیں اور کبھی کبھار ایک جاسوسی ناول۔ کتنے مستعد' چالاک اور ہوشیار وہ اپنے کاروبار میں ہوتے ہیں۔ آدمی ان کو حیرت سے نہ دیکھے تو کیا کرے؟ خدا جانے کس اسکول اور ماحول میں ان کے یہ قابل دماغ تربیت پاتے ہیں۔ کونسا تقدیر کا چکر' کون سے خارجی حالات اور حادثات ایسے آدمیوں کو ڈھالتے ہیں جو ''کر سکتے ہیں'' دماغ کی کون سی عجیب تعلیم ایسے کامیاب آگے بڑھنے والے لوگ پیدا کرتی ہے۔ ہم بے چارے نااہل بزدل آدمی محض تعجب ہی کر سکتے ہیں! مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ ایفی شنٹ انسان کا ٹائپ ہزاروں سال پہلے بھی اس کرے پر جانا پہچانا تھا۔ وہ آدمی تھا جو کوڑے کے ساتھ گدوں پر آرام سے لیٹتا تھا۔ اور جب گیلی کے کئی سو کھینے والے غلام چپو چلاتے چلاتے نڈھال ہو کر سست ہو جاتے تھے تو اس کے کوڑے کی پٹاخ انہیں پھر ہوشیار کر دیتی تھی۔ یہ آدمی اصل حاکم ہیں۔ ہم صرف ان کے غلام ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں روح نہیں ہے اور کھلتی ہوئی شفق کا حسن بھی ان کے دل سے واٹر پروف پینٹ نہیں دھو سکتا۔ کیسی موٹی اور مضبوط کھال ان ایفی شنٹ لوگوں کی ہوتی ہے!

کچھ عرصے سے اپنی کیورس اور میں سرداروں کو چائے کی دعوت دینے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ہم دونوں اجنبی لوگوں سے گفتگو میں پہل کرنے کے معاملے میں شرمیلے ہیں۔ میں اپنی کیورس کو جا کر سرداروں کو مدعو کرنے کے لیے کہتا' اور وہ مجھے...... آخر میں نے جی کڑا کیا۔ سرداروں کی میز کی طرف گیا۔ اور اس پر اپنے ہاتھ ٹیک کر میں نے لڑکھڑاتے لہجے اور سرخ چہرے سے انہیں اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔ پتلے سکھ نے انگریزی میں شائستگی سے معذرت کی۔ میں نے ٹکٹ چیکر کے رویے کے لیے معافی مانگی۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے نام بتائے۔ ان کے مسلمان لاہوریئے دوست کی باری آئی تو وہ پھر چھیڑ سے باز نہ رہ سکا۔ ''میرا نام چمن لال ہے...... انڈین نیشنل'' اس کے ساتھی ہنسے۔ پھر میں نے اپنا تعارف کرایا۔ پتلے سکھ نے مجھے بتایا کہ وہ جالندھر میں کسی مشینری کے امپورٹ کے کاروبار میں ہے...... میں آخر اپنے مشن میں ناکامیاب اپنی کیورس کے پاس لوٹ آیا۔

ہم اب لاہور کے نزدیک تھے۔ اندھیری مخملی رات میں پیلی نیلی اور سرخ روشنیاں بکھر رہی تھیں۔ ہمارے دلوں نے وہ لذیذ دھڑکن محسوس کی جو لاہور میں وارد ہونے والے ہر سچے مسافر کو محسوس ہوتی ہے۔ تم خواہ پہلی بار لاہور کے نزدیک آؤ خواہ بیسویں بار' یہ عجیب روح کی اٹھان یہ پر اشتیاق دھڑکن تمہیں ضرور محسوس ہوگی۔ لاہور ایک ایسی کافر محبوبہ ہے لاتعداد دلربائیوں اور عشوہ طرازیوں کی حامل' کہ اس کے چاہنے والے اس کے لیے ہمیشہ تڑپتے رہتے ہیں۔ گاڑی اسٹیشن سے پہلے رکی۔ پھر آہستہ آہستہ دبے پاؤں چلتی ہوئی جگمگاتے ہوئے پلیٹ فارم نمبر چار میں داخل ہوگئی۔

لاہور پورے دو سال کے بعد...... باہر اسٹیشن کے وسیع ایوان میں کھڑا تھا۔ اسے آج ہمارے آن پہنچنے کی امید نہ تھی اس لیے وہ پلیٹ فارم پر نہ آیا تھا...... چھ ٹیکسیوں کا مالک ہے اس اچھے آدمی نے اپنی ایک ٹیکسی منگوا کر ہمارا سامان ڈکی میں رکھوا دیا۔ اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی وہ ہم سے پیسے نہ لے۔ یہ کہتے ہوئے وہ ہنسا کیونکہ یہ بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم قیصر کے کوزی آرام میں اس اسرار اور جادو کی دنیا میں پھسلتے ہوئے گئے جو شہر لاہور ہے۔ ہم پہلے پنجاب ٹرانسپورٹ کے اڈے پر جوہر آباد جانے والی بس کا پتہ کرنے کے لیے گئے۔ ''ساڑھے پانچ بجے صبح بس چلتی ہے'' ہمیں بتایا گیا۔ اس کے بعد ہم سیدھے ہوٹل میں آئے۔ ہوٹل مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر ہمیں ہوٹل کے بیک یارڈ میں ایک لمبا' قدرے افسردہ کمرہ مل گیا۔ یہ کمرہ قتل کے لیے چلا تا تھا۔ جب کبھی مجھے کسی شخص کو قتل کرنے کی خواہش ہوئی تو میں اسے ہوٹل کے اس کمرے میں لے جاؤں گا۔ کمرے کے پیچھے ایک کوڑے بھرا صحن بھی ہے۔ نعش کو بڑے مزے اور چپکے سے وہاں پھینکا جا سکتا ہے۔

لاہور میں ہمیں جو سب سے ضروری کام کرنا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ہمیں ''آن دی واٹر فرنٹ'' فلم دیکھنا تھی جیسے ہی ہمارا سامان کمرے

میں رکھا گیا۔ ہم اسے مقفل کر کے تانگے پر کراؤن سینما پہنچے۔ ہم دوسرے شو کے شروع ہونے سے چند منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔ فلم کو ہم نے پسند کیا کیونکہ یہ سات اکادمی ایوارڈ جیت چکی تھی۔ اسے ناپسند کرنا گویا اپنی کور ذوقی اور اوسط خیالی کا اقرار کرنا تھا۔ اپی کیورس زیادہ تر فلم کے ہیرو مارلن برانڈو کی دماغی حالت کا مطالعہ کرنے گیا تھا۔ اسے پاگل یا تقریباً پاگل لوگوں سے بڑی محبت ہے۔ فلم کے بعد اپی کیورس نے مجھے نہایت اطمینان سے خوش خبری دی کہ مارلن برانڈو اب دیوانگی کی مبارک منزل سے زیادہ دور نہیں...... یہ سارا مذاق نہیں پھر بھی فلم اپنی معمولی کہانی کے حقیر مصنوعی ڈھانچے کی حدود میں نہایت خوبی سے ایکٹ کی گئی تھی بلاشبہ اسے دیکھنا ایک پرشدت جذباتی تجربہ تھا اور اس میں دو تین ایسے سین تھے جو ہمیشہ کے لیے ذہنوں پر داغ ہو جاتے تھے فلم سے آتے ہی ہم بستر بند کھول کر اپنے کپڑوں اور بوٹوں سمیت سو گئے۔ جب میری آنکھ کھلی' کمرے کی بتی آن تھی اور اپی کیورس اٹھ چکا تھا۔

''اٹھو بھئی۔'' اپی کیورس نے کہا ''ساڑھے چار ہو گئے۔''

''کیا جوہر آباد جانا ضروری ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''قطعاً''

ایک دیہاتی الوداع

ہم بس کے اڈے پر پہنچے تو ابھی جھوٹی صبح کا وقت تھا۔ رات کے سائے ابھی چھائے ہوئے تھے۔ بکنگ کلرک ابھی نہیں آیا تھا۔ ہم نے چائے کی ایک چھوٹی دوکان میں میٹھی چائے اور مکھن لگے برمی بنوں کا ناشتہ کیا۔ ان چھوٹی چائے کی دوکانوں میں جو ساری رات کھلی رہتی ہیں' مجھے کچھ بڑا رومینٹک ماحول نظر آتا ہے۔ ان کی کھردری سی میزیں' ٹین کی کرسیاں' نیلی تام چینی کی چائے دانیاں ...... میں ان سب سے محبت کرتا ہوں۔ اور ان لوگوں سے بھی جو وہاں آتے ہیں۔ یہاں ہمیشہ ایک رفاقت کی خوشبو ہوتی ہے اور وہاں زندگی کی گہما گہمی کا مزا چکھتے ہو۔ ہم نے اپنے آپ کو سچا ''ویگابانڈ'' محسوس کیا۔ وقت اب ساڑھے پانچ کا تھا۔ بکنگ کلرک اب بھی لاپتہ تھا۔ ہم نے سامان کو اپنی بس کی چھت پر رکھوا کر اس میں ڈیرہ جما دیا۔ اپی کیورس نے صبح کا اخبار ایک لڑکے سے خریدا ہم نے اسے پڑھنے کے لیے بس کی اندر کی روشنی کو آن کر دیا۔ جونہی ہم نے اسے ''آن'' کیا داڑھی والا کھولیا کنڈکٹر اندر چلا آیا۔

''بادشاہو۔ تسیں لیٹ آن کروتی اے۔ بیٹری ڈاؤن ہو گئی تے رستے وچ ہی رہ جانگے۔'' اس نے لائٹ آف کر دی۔ اس وقت سے بس کنڈکٹر گویا ہمارا دوست ہو گیا۔

بس اڈے سے چلی تو پو پھٹ رہی تھی۔ لاہور کا شہر بیدار ہو رہا تھا۔ بھوری اینٹ اور پتھر کی عمارتیں انگڑائی لے کر جاگ رہی

تھیں۔ویسے تولاہور ہروقت ہی خوبصورت ہے لیکن صبح تڑکے کے وقت شہر ایک طلسماتی...... روپ اختیار کرلیتا ہے۔یہ بڑا عجیب ہے کہ ہمارے شاعروں نے لاہور کی صبح پر نظمیں نہیں لکھیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو یہاں اصل شاعر ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں تو انہوں نے لاہور میں صبح ہوتے دیکھی نہیں اتنے اہم اور عظیم حادثہ کا گزرنا کسی شاعری کو کیسے بے حس چھوڑ سکتا ہے۔

ہمارے جدید نوجوان اور طباع شاعروں میں سے ایک دو اس موضوع پر ایک اچھی اور یادگار سونیٹ (Sonnet) لکھنے کے ضرور اہل ہیں۔لیکن وہ اس وقت نئے ''مذہبوں کے بانیوں پر قصیدے اور صحیفے مرتب کرنے میں مصروف ہیں جن کو وہ شاعری سمجھتے ہیں۔ان کے یہ قصیدے دوسرے روز ہی اتنے پرانے ہو چکتے ہیں جتنا کل کا اخبار۔آہ! شاعری کی کشت پر اب خزاں کا سایہ ہے۔ بڑے شاعروں کا زمانہ شاید اب ہمیشہ کے لیے بیت چکا اور اردو شاعری کو غالب۔میر اور اقبال پھر نصیب نہ ہوں گے۔اس لیے لاہور کی صبح کی ہو بہو نقاشی اب شاید کبھی نہ ہوگی۔ہمارے شاعر اتنے ہوشیار اور ترقی یافتہ ہو گئے ہیں کہ وہ اس قسم کی چیزوں پر مزید وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ہر وہ چیز جس کا تعلق بالواسطہ ان کے محبوب موضوع سے نہیں ہوتا ان کے نزدیک فرسودہ اور بورژوا رجحانات کی حامل ہے۔

ہم راوی پر سے گذر کر شیخوپورہ جانے والی سڑک پر مڑے تو سورج نکل آیا۔ہمارے گرد کی وسیع کھیتوں اور سبزے کی دنیا دمک اٹھی۔ہمارے دل گانے لگے۔ہوا میں بہار کا سانس تھا۔فصلیں کٹ چکی تھیں اور کٹے ہوئے کھیت پیلے سونے کے سے تھے۔پن بجلی کے تاروں کو اٹھانے والے لوہے کے برج اس پرسکون دیہاتی سین پر دیوؤں کی طرح بدصورت لگتے تھے...... ان کو یہاں ہونے کا کوئی حق نہ تھا...... بھینسیں اور گائیں کھیتوں میں کاہلی سے چر رہی تھیں اور دکھوں اور فکروں سے بھرے ہوئے دل کو عجیب سکون اور راحت دیتی تھیں۔ان کی زندگی بیشتر انسانوں سے کہیں خوبصورت تھی...... وہ گھنٹوں کھڑی ہو کر نیلے آسمان کو دیکھ سکتی تھیں۔

ہمارے شیخوپورہ پہنچتے پہنچتے ہلکے بادلوں کے آجانے سے دن دھندلا گیا۔ایک سیمیں سا کہرا اکبر کے لخت جگر شیخو بابا کے شہر پر اتر آیا۔شیخوپورہ ایک رومینٹک لڑکھڑاتا ہوا شہر ہے۔پنجاب کے بہت سے شہروں کی مثل 'دودھ' دہی اور پھلوں کی دوکانوں سے بھرا ہوا' اس کے سرخ اینٹوں کے پرانے مکان بارش اور ہوا کے اثر سے کالے ہو رہے ہیں' ایک اونچائی پر سیاہ تیوری کی طرح اپنے جھروکوں اور محراب دار بالکنیوں کے ساتھ پرانا قلعہ ہے۔جس کی پتھریلی سنگلاخ دیواریں مرور زمانہ سے مائل ہو گئی ہیں اور جو شہر پر چھایا ہوا ہے۔شیخوپورہ سے اس کے قلعے کو لے لو' تو اس میں سوائے اس کی غلیظ دوکانوں اور سنگترے اور مالٹے کے باغوں کے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔شیخوپورہ ضلع کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ہماری لاری وہاں اڈے میں پندرہ منٹ رکی اور ہم نے وہاں مالٹے خریدے۔شیخوپورہ سے چل

کر ہم کھیتوں میں پڑے ہوئے کئی قصبوں اور چھوٹے شہروں میں سے گزر گئے...... بعض میں تھوڑی دیر کے لیے رکتے ہوئے اور اکثر کو نظر انداز کرتے ہوئے کئی دفعہ دہقانی مرد اور عورتیں ہاتھ کھڑے کر کے بس کو ٹھہراتے۔ ان میں سے کئی اپنے گاؤں سے گھوڑیوں پر چڑھ کر بس کے سٹاپ پر پہنچے تھے اور شاید گھنٹوں سے لاری کا انتظار کر رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر صفراوی المزاج چڑچڑے ڈرائیور اور اس کے کنڈکٹر میں ہمیشہ جھگڑا ہوجاتی۔ یہ داتا کل کل اور تکرار ان میاں بیوی کے گھریلو جھگڑوں کی سی لگتی جو بظاہر ایک دوسرے سے سیر ہو چکے ہوں۔ زبردستی ہمیشہ ڈرائیور کی ہوتی اور ہماری ہمدردیاں قطعی طور پر مقطع داڑھی والے چشمہ لگے کنڈکٹر کے ساتھ ہوتیں۔ یہ شخص کنڈکٹر سے زیادہ ایک امام مسجد لگتا تھا۔ اور مجھے شک ہے کہ ہم میں سے کمیوں کی طرح اپنے اس پیشے پر فٹ نہ آتا تھا۔ مگر وہ ایک سادہ دل مخولیا آدمی تھا اور ڈرائیور کی جھڑکیوں کو ایک فلسفی کی طرح خوش مزاجی سے قبول کرتا تھا۔ میں نے اسے صرف ایک بار قدرے برہم ہوتے دیکھا اور وہ بھی ایک لحظے کے لیے۔

بس کسی سواری کو چڑھانے کے لیے ٹھہرتی تو کنڈکٹر بڑے مزے سے نیچے اترتا اور چڑھنے والے دہقان سے پوچھتا۔ ''بزرگو! آپ نے کہاں جانا ہے؟'' اب یہ ایک ضروری استفسار تھا کیونکہ کئی مسافروں کو سوار ہونے کے بعد پتہ چلتا کہ وہ غلط بس میں چڑھ گئے ہیں کنڈکٹر سواریوں کو کرائے سے بھی مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتا تا کہ وہ پہلے ہی اپنا اطمینان کر لیں کہ ان کے پاس منزل پر پہنچنے کے لیے پورا کرایہ موجود بھی ہے۔ اب ایسی پوچھ گچھ میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے مگر اس سے ڈرائیور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا۔

''اوئے مولوی!'' ڈرائیور برہمی سے چلاتا ''تم تو سواریوں سے باقاعدہ مجلس گرم کرنے لگ جاتے ہو۔''

''زبردستو'' کنڈکٹر کہتا۔ ''پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے ورنہ میں نے ان سے کونسا گھوڑا لینا ہے۔''

ایک بار جب ایک ایسی سواری چڑھ آئی جسے اور لاری میں چڑھنا چاہیے تھا۔ تو ڈرائیور کے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔ ''اوئے مولوی! تم کو بس کنڈکٹر کس نے بنا دیا۔ تم کو یہ بھی پتہ نہیں کہ سواری کو پوچھے بغیر نہیں چڑھانا چاہیے۔''

ڈرائیور اپنے کنڈکٹر پر بلاوجہ برہم تھا۔ زبردست ہونے کی وجہ سے اس کا ٹھینگا ہمیشہ کنڈکٹر کے سر پر رہتا' خواہ اس کا قصور ہوتا یا نہ ہوتا مولوی کنڈکٹر کا مزاج اس تکرار سے قطعاً مکدر نہ ہوتا۔ وہ اس کا عادی تھا۔ ممکن ہے وہ اس تکرار کو ناپسند نہ کرتا ہو۔ صرف ایک دفعہ وہ عاجز ہو کر ڈرائیور کے سامنے بول پڑا۔ بس چنیوٹ کے آگے چناب کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ ایک دہقان اپنے گدھوں کو ہنکاتا ہوا سامنے سے آ رہا تھا۔ اس نے اپنے گدھوں کو روکنے اور ایک طرف کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ کسی طرح ہٹتے نہ تھے اور سڑک کو روکے ہوئے تھے ڈرائیور نے بس کو روک دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے گرم ہو کر کنڈکٹر کو ڈانٹا۔ مولوی تم کیا دیکھ رہے ہو۔

اچھے کنڈکٹر ہو۔ نیچے اتر کر گدھوں کو کیوں نہیں ہٹواتے۔"

مولوی نے غصے میں کہا" میاں جی! یہ عجب تماشا ہے۔ کنڈکٹر کا یہ کام تو نہیں کہ گدھوں کو ہٹائے۔"

لیکن پھر اس نے بس سے اتر کر ڈرائیور کے حکم کی تعمیل کی اور دہقان کو گدھوں کے ہٹانے میں مدد دینے لگا مگر اس خوش مزاجی اور مسخرے پن سے کہ خود ڈرائیور بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

کوئی گیارہ کا وقت ہو گا کہ ہم ایک چھوٹے قصبے کے اڈے پر رکے جس کا نام شاید پنڈی بھٹیاں تھا۔ اڈے میں ایک معمارانہ خوبی تھی دو رویہ دفتروں اور مسافر خانوں کے آخر میں ایک محرابوں والا اونچا دروازہ۔ سڑک اس میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ کھیتوں کی ہریالی یہاں ایک بھولی بسری کہانی تھی۔ قصبہ ایک مٹیالے اور کھردرے علاقے میں تھا۔ سورج کی گرمی اب تیز ہو رہی تھی۔ اور اگرچہ یہ ابھی اپریل کا وسط ہی تھا مگر گرما کی دوپہروں کی ویران اداسی اڈے کی فضا پر محیط تھی۔ لاری یہاں کافی دیر ٹھیری۔ ہم نیچے اتر آئے۔ دیہاتی مردوں اور عورتوں کے ایک گروہ نے ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ایک کنبے کے افراد تھے دور اور نزدیک کے قرابت دار۔ اور اپنے ایک بیمار قرابتی کو لاری میں چڑھانے کے لیے آئے تھے۔ ایک چھوٹی سرخ رنگ کی گھوڑی جس پر ایک دیسی کاٹھی کسی تھی' پاس بندھی تھی۔ میں نے سوچا کہ بیمار قرابتی اس پر چڑھ کر آیا تھا۔ باقی گھرانے کے افراد کیا مرد کیا عورتیں اپنے دور کے گاؤں سے چل کر آئے تھے۔ علیل آدمی ایک بیس سالہ دبلا دیہاتی تھا۔ اس کا ہلکی داڑھی والا چہرہ مٹی کی رنگت کا تھا' اس کی آنکھیں ایک مدقوق کی آنکھوں کی مانند عجیب بخار سے جلتی تھیں ...... پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ واقعی دق کا مریض ہے اور سرگودھا کے ہسپتال میں داخل ہونے جا رہا ہے۔ اس کی ماں ...... ایک بوڑھی سکڑی ہوئی خمیدہ کمر عورت اپنے بیٹے کے ہمراہ جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عمر کے غموں اور دکھوں نے اپنی نشانیاں ثبت کی ہوئی تھیں۔ اور اس کے بیٹے کی بیماری اسے مار رہی تھی۔ قرابت داروں میں سب سے معتبر ایک گچھے دار مونچھوں والا چودھری تھا۔ اس کا سیاہ چمڑے کا چہرہ ایک الو کے چہرے کی طرح سنجیدہ تھا۔ وہ اپنی جگہ ایک لاٹ بنا ایستادہ تھا اور گھلتے ہوئے مریض اور اس کی ماں کو دلاسے اور تسلیاں دیتا تھا" فکر نہ کر ماسی' اللہ حق داد کو شفا دے گا۔" دوسرے عزیزوں میں' میں نے ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کو نوٹ کیا۔ نو بیاہتا دیہاتی جوڑوں میں کھلتے ہوئے پھولوں کی رونق اور رنگینی ہوتی ہے اور تم ان کو ایک مجمع میں الگ کر کے بتا سکتے ہو۔ ان کی حرکات میں جوانی کی سہل بے پروائی ہوتی ہے اور ان کے چہروں میں بہار کی شادابی بلا شبہ وہ ایک دائمی دھنک کے رنگوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ غم کے سانس نے ابھی ان کو نہیں چھوا ہوتا" مرد" ایک اٹھارہ سال کا کڑیل لڑکا تھا۔ اس نے ایک لش لش کرتا ہوا لاچا پہن رکھا تھا پاؤں میں طلے دار جوتی' اور سر پر رنگا ہوا صافہ۔ شاید

اس نے اس اہم ترین دن کو بھی یہی لباس پہنا ہوا تھا۔ جب وہ گھوڑی پر لاڑا بنا ایک البیلے سورما کی طرح اپنی دلھن کو لانے نکلا ہو گا۔ عورت اس کی ہم عمر تھی۔ اور ایک مطمئن اور تخریلی بلی کی طرح ایک درخت کے سائے کے نیچے بیٹھی تھی اور نیم نشیلی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ دق زدہ نوجوان کا جانا اس کے لیے کچھ نہ تھا۔ جب بیمار بس میں چڑھنے لگا تو اس کے سارے عزیز و اقربا اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس منظر میں ایک حزن تھا جسے کوئی الفاظ کبھی بیان نہ کر سکیں گے اس نے باری باری سب کو گلے سے لگایا۔ کئی آنکھوں میں آنسو ڈھلک آئے اور رندھی ہوئی آواز میں اس کی ماسیوں اور خالاؤں نے اسے دلاسے دیئے کہ وہ جلد ہی شفایاب ہو جائے گا۔ بیمار آدمی کی ''صبوحی'' کو میں نے نہ دیکھا۔ شاید اس کی ''صبوحی'' تھی ہی نہیں' اور اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کو الوداع کرنے والے اقربا دل میں جانتے تھے کہ حق دار کی گھلا دینے والی بیماری مہلک اور جان لیوا ہے کہ اس دنیا میں اس کے ایام اب گنے ہوئے تھے۔ اس دیہاتی الوداع کی تصویر میرے ذہن میں نقش ہو گئی ہے۔ یہ احمد ندیم کے ایک لافانی روشن قطعے کی طرح یاد میں دمکتی رہتی ہے اور ''صبوحی'' کے شاعر عاشق نے ہماری خوش قسمتی سے ان دیہاتی مفارقتوں کے الم حسن اور رومان کو اپنے پرکار قطعوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے ہم اس کے کتنے کتنے شکر گزار ہیں!

اس قصبے کے آگے سوکھے اور سرخی مائل میدان تھے جن پر کبھی ہل نہیں چلا تھا۔ بھوری پہاڑیاں نمودار ہوئیں...... چرمیں پڑے ہوئے کاغذ کی طرح۔ ہم چنیوٹ کے پاس چناب کی سرخ ابلتی ہوئی وسعت کے اوپر سے گزرے۔ دریا کے پرے ''ربوہ'' بیرک نما مکانوں کا ایک طویل شہر تھا۔ تین چار سیمنٹ کنکریٹ کی بنی ہوئی شاندار کوٹھیاں اس میں نمایاں تھیں اور اپی کیورس اور میں نے قیاس دوڑایا کہ احمدیہ جماعت کے موجودہ خلیفہ ان میں سے ایک میں رہتے ہوں گے۔ ربوہ میں زندگی کے آثار نہ تھے جھلستے ہوئے سورج کے نیچے شہر ایک مستقل ویرانی تھا۔ ایک چھوڑی ہوئی چھاؤنی۔ سنا ہے اس سے پرے میلوں زمین بھی احمدیہ جماعت نے حاصل کر رکھی ہے۔ یہ زرخیز چراگاہ ہے جس میں گھاس آدمی کے قد جتنی لمبی ہوتی ہے......

ساڑھے بارہ بجے ہم سرگودھا میں سے گزرے۔ سرگودھا عمدہ عمارات۔ خوشنما کوٹھیوں اور باغات کا شہر ہے۔ علیل نوجوان اور اس کی خمیدہ ماں دق کے ہسپتال کے سامنے اترے اور ہم نے ان کو مایوس ماندے قدموں کے ساتھ ہسپتال کی شاندار بارعب عمارت کی طرف جاتے دیکھا۔ آگے خوشاب ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ یہاں تم گویا پربت کی عنابی پہاڑیوں کے سایے میں آجاتے ہو اور اچانک ان کی موجودگی سے آگاہ ہو جاتے ہو۔ ہمارا احمد ندیم بھی تو انہی پہاڑوں کا رہنے والا ہے۔ اپی کیورس نے مجھے بتایا کہ یہ پہاڑ نمک کا پہاڑ ہے۔ یہ نمک کا ہو سکتا ہے مگر یہ گلاب اور عنبر کے رنگ کا ہے۔ یہ ایک مستقل طور پر جھانکتا ہوا پہاڑ ہے ار خوشاب

کے بازاروں اور چوکوں کوایک زندہ۔شفیق دوست کی مانند دیکھتا رہتا ہے۔لوگ کڑیل اور صحتمند اور جاندار ہیں۔ان میں اپنے وطن اور نسل کا غرور ہے اور وہ اپنے کوایک مردانہ وجاہت سے گیری کرتے ہیں۔دنیا میں بہتر چیز ایک پہاڑ پر رہنا ہے اور اس کے بعد دوسرے درجے پر ایک پہاڑ کے دامن میں یا اس کی دید میں رہنا ہے۔کوہستانی لوگوں میں ایک ایسی کٹیلی مردانگی اور لطافت آجاتی ہے جو میدانوں میں رہنے والوں میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔

خوشاب سے ہماری منزل بمشکل چار میل تھی اور ایک بجے دوپہر کواپی کیورس اور میں جوہر آباد کے بس کے اڈے کے باہر تپتی دھوپ میں اپنے بستروں اور سوٹ کیسوں کے انبار کے پاس قدرے بجھے ہوئے کھڑے تھے۔اس سارے سامان کواپی کیورس کے میزبان کے گھر لے جانا ہمارا پرابلم تھا۔دور دور تک نہ کوئی تانگہ نظر آتا تھا اور نہ کوئی مزدور۔ہم نے اپنے آپ کو اتنے سامان کے ساتھ سفر کرنے پر دل میں کوسا۔

میں نے ''تھل'' کے صحرا میں پڑے ہوئے اس شہر پر پہلی بار نظر دوڑائی اور وہ چیز جو مجھے اس کے متعلق پسند آئی یہ تھی کہ گلابی پہاڑیاں اس کے قریب تھیں۔ریل کی لائن کے پرلی طرف وسیع فیکٹری ایریا تھا۔شاندار مکانوں کے بلاک اور تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے دفاتر کی مرعوب کن'مہیب عمارات۔وہ بابل کے محلات لگتی تھیں اور افق پر اڈتی معلوم ہوتی تھیں...... ریلوے لائن کے اس طرف جہاں ہم کھڑے تھے'جوہر آباد کا اصل شہر تھا۔یہ ایک نقشے کی مانند صاف اور سپاٹ پڑا ہوا تھا۔سڑکیں چوڑی اور سیدھی تھیں۔وہ ایک دوسرے کوزاویہ قائمہ پر کاٹتی تھیں۔اس کے مکان زیادہ تر یک منزلہ تھے۔اور تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے منظور شدہ ٹائپ ڈیزائنوں کے مطابق بنے ہوئے تھے۔ہریالی بہت کم تھی اور شہر ایک چٹیل بھورے میدان میں سورج کے بے رحم کرنوں کے نیچے کھلا پڑا تھا...... اپی کیورس نے میرے سامنے جوہر آباد کی کافی تعریفیں کی تھیں لیکن یہ اس قسم کا شہر نہ تھا جسے میں پسند کرتا ہوں۔

سچی بات یہ ہے کہ میں سیدھی سڑکوں اور ٹائپ ڈیزائنوں کے مکان بنانے کے جدید خبط کو نہیں سمجھ سکتا۔میرے نزدیک اچھا شہر وہ ہے جس کے کوچے خوش آیند طریق پر ٹیڑھے میڑھے اور پیچیدہ ہوں اور جس کی اونچی دودوسہ منزلہ جھلملیوں کے دریچوں والی حویلیاں باہم دست وگریباں ہو رہی ہوں۔سب ایماندار شہروں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔اگر اس شہر کے گرداگرد فصیل ہو اور ایک پرانی خندق بھی۔تو تم وہاں ساری عمر گزار سکتے ہو اور تمہارا دل ایک لمحے کے لیے بھی نہیں تھکے گا۔ایک شہر کے لیے لازم ہے کہ اس کا ایک کردار ہو...... ایک روح...... ٹیڑھی گلیوں میں کتنا رومان اور اسرار ہوتا ہے؟اور رومان اور اسرار کے بغیر ایک شہر رہنے کے لائق جگہ نہیں ہے۔ہمارے مورث اس چیز کو جانتے تھے۔اسی لیے انہوں نے ٹیڑھی گلیوں اور فصیلوں والے شہر تعمیر کیے اور اسی لیے وہ ہم

سے زیادہ خوش تھے۔ ہاں! جوہرآباد جدید اور بے رنگ اور روح تھا۔ صرف وہ لوگ یہاں رہنا گوارا کرسکتے تھے جو رہنے پر مجبور تھے یا جن میں تخیل کی لو کبھی نہ بھڑکی تھی۔

ہم تپتے ہوئے سورج کے نیچے اپنے سوٹ کیس اور بستر لیے کسی تانگے کا انتظار کرنے لگے۔ پندرہ بیس منٹ کے انتظار کے بعد تانگہ تو کوئی نہ آیا البتہ مزدور بچوں کے ایک دستے نے ہم پر ہلہ بول دیا۔ وہ کوئی ایک درجن تھے۔ ہمارے احتجاجوں کے باوجود بیک وقت سب نے ہمارا سامان اٹھانا شروع کردیا۔ ایک نے اٹیچی کیس اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ اپی کیورس کے بستر کو تین لڑکیوں نے اپنے سروں پر اس طرح رکھ لیا جیسے یہ ایک بیش بہا خزانہ ہو۔ چوتھا لڑکا اسے درمیان سے سہارا دیئے ہوئے تھا تاکہ وہ گر نہ پڑے۔ میرے بستر کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ ہمارے کل چار نگ تھے۔ دو بستر ایک اٹیچی اور ایک سوٹ کیس۔ ایک درجن بچے ان کو اٹھائے تھے یا اٹھانے والوں کو اخلاقی سہارا دے رہے تھے۔ ہم ایک قافلے کی صورت میں بچوں کی فوج کو جلو میں لیے اس بزرگ آدمی کے مکان پر پہنچے جس سے اپی کیورس کو کام تھا۔ وہ تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ایک چھوٹے ٹائپ مکان میں اقامت پذیر تھا۔ خوش قسمتی سے وہ اس وقت مکان پر موجود تھا...... اجلے کپڑوں میں سفید داڑھی والا ایک شگفتہ مزاج بوڑھا آدمی...... فادر کرسمس! ......وہ اس سے بڑا مشابہ تھا) اپنی بیٹھک میں چارپائی پر لیٹا مولانا پرویز کی ایک کتاب "سلیم کے نام" کا مطالعہ کررہا تھا پرویز صاحب میرے باپ کے چہیتے دینی مصنف ہیں اور مذہب کے بارے میں اس کے بیشتر نظریے اسی مصنف کے خیالات کے مرہون منت ہیں۔ اس حسن اتفاق نے میرے دل میں فادر کرسمس سے ایک گونہ ہمدردی پیدا کردی۔

فادر کرسمس کے تھوڑے بہت تعارف کی ضرورت ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ سول انجینیر تھا۔ اس کی اپی کیورس کے باپ سے گہری دوستی تھی۔ اپی کیورس کے باپ نے تھل میں زمینیں خرید کی تھیں اور ریٹائر ہونے کے بعد یہاں آباد ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے پہلی ضروری چیز ایک رہائشی مکان تھا اور فادر کرسمس دوستی کی بنا پر اور موقع پر موجود ہونے کی وجہ سے اس مکان کی تعمیر کی نگرانی کررہا تھا ......اپی کیورس کو اسی مکان میں بعض مجوزہ تبدیلیوں کے بارے میں فادر کرسمس سے گفتگو کرنا تھی۔ اس کا جوہرآباد میں آنے کا یہی مقصد تھا۔

فادر کرسمس نے ہمارا کل سامان اپنی چارپائی کے نیچے رکھوا دیا۔ اپی کیورس نے مصلحتاً جھوٹ بولا کہ ہمیں شام کو پانچ بجے تک خوشاب میں اپنے ایک دوست کے یہاں واپس پہنچنا ہے جو ہمارا انتظار کررہا ہوگا۔ فادر کرسمس اس اطلاع سے کافی مطمئن سا معلوم ہوا۔ پھر اس نے پوچھا کہ ہمیں کھانا تو کھانا ہی ہوگا۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ میں نے پرامید نظروں سے اپی کیورس کی طرف دیکھا۔ مگر

اپی کیورس نے کمال ضبط سے فادر کرمس کو یقین دلایا کہ ہم خوشاب سے کھانا کھا کر چلے تھے۔ فادر کرمس نے کہا" تکلف کی بات نہیں۔ نہ کھایا ہو تو میں تیار کرنے کے لیے کہلا دوں۔" مگر اپی کیورس اپنی بات پر ثابت قدمی سے ڈٹا رہا...... اس امر واقعہ کے باوجود کہ پچھلے دن لنچ کے بعد ہم نے باقاعدہ کھانا نہیں کھایا تھا اور اب ہم دونوں بھوک کے مارے تقریباً جاں بلب ہو رہے تھے۔

اپی کیورس اور فادر کرمس تھوڑی دیر مکان کے منصوبے کی تبدیلیوں پر بحث کرتے رہے' اپی کیورس' میرا خیال ہے' مکان میں دو گیراج بنانے کا خواہشمند تھا۔ فادر کرمس کی رائے میں ایک گیراج ہی ضرورت کے لحاظ سے کافی تھا۔ فادر کرمس نے دھوپ میں اپی کیورس کے ساتھ موقع پر چلنے پر رضامندی ظاہر کی۔ ہم چھدری نمو سے سایہ دار سڑکوں پر چلتے اس جگہ پر پہنچے جہاں اپی کیورس کا مکان زیر تعمیر تھا۔ فادر کرمس اور اپی کیورس نے مکان کے پلین پر ایک طویل بحث کی اور ایک گھنٹے کے بعد اس کے گیراجوں کے مسئلے کو تسلی بخش طور پر حل کر لیا۔ اس امر کے باوجود کہ میں پتھر اور اینٹوں کی سب عمارتوں کے خلاف ہوں' میں نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔

فادر کرمس پھر ہم سے تھوڑی دیر کے لیے جدا ہو گیا۔ اس نے مزدوروں کو اپنے مکان کے بارے میں چند ہدایات دینا تھیں جو اب تکمیل کے آخری مرحلے پر تھا۔ یہ مکان ایک وسیع مسجد لگتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ انجینئرنگ کے پیشے کے لوگ عمارتوں کے جمالیاتی پہلو سے اس درجہ نابلد ہوتے ہیں (اپی کیورس اس سے مستثنیٰ ہے)

واپس لوٹتے ہوئے (فادر کرمس کے بغیر) اپی کیورس جوہر آباد کے بارے میں جوش اور وارفتگی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ صحراؤں سے محبت کرتا ہے ان سے بھی زیادہ پہاڑیوں سے۔ اور جوہر آباد میں دونوں چیزیں موجود تھیں۔" اس جگہ کی بڑی کشش یہ ہے۔" اس نے کہا کہ پہاڑیاں اتنی قریب ہیں اور آدمی کسی وقت بھی ان تک پہنچ سکتا ہے۔"

"وہاں" اپی کیورس نے پہاڑیوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا" ندیم کا گاؤں انگہ ہے۔"

اس نے ان پہاڑیوں کو میری نگاہ میں اور رومینٹک بنا دیا۔

سیدھے فادر کرمس کے مکان پر جانے کی بجائے اور تھکاوٹ اور گرمی کے باوجود ہم جوہر آباد کے بازار میں نکل آئے۔ دورویہ ستونوں پر ایستادہ چوڑے برآمدوں والی دوکانیں تھیں۔ یہ دوکانیں تو شاندار تھیں مگر بیشتر دوکاندر چھوٹے نانبائی یا اشتہاری حکیم یا حجام تھے۔ یہ ایک مایوس کن بازار تھا۔ میں نے متعدد قصبے دیکھے ہیں۔ جہاں کے بازار اس سے کہیں پر رونق اور پر رنگ ہیں۔ ایک فرلانگ کی سیر میں ہم نے پانچ ہیر کٹنگ سیلون دیکھے۔ انہیں دیکھ کر ہمیں یاد آیا کہ ہمیں شیو کی سخت ضرورت تھی۔ ہم ایک سیلون میں جا

گھسے ...... یہ ایک بے انتہا غلیظ اور تاریک جگہ تھی۔حجام صورت سے ایک قاتل معلوم ہوتا تھا مگر ایک بار اندر جا کر پلٹنا ناممکن تھا۔ میں نے ایک بالکل کند استرے سے حجامت کرائی اور میری سفارش پر اپی کیورس بھی اس آزمائش سے گزر گیا۔ بازار میں کچھ اور وقت ضائع کرنے کے بعد جب ہم فادر کرمس کے مکان پر پہنچے تو وہ ہماری راہ دیکھ رہا تھا اور تعجب کر رہا تھا کہ ہم کہاں گم ہو گئے تھے۔ اسی کمرے میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد (اپی کیورس نے غسل کا ارادہ ترک کر دیا تھا) ہم نے چائے پی' فادر کرمس نے انتہائی نیک دلی اور مروت سے چائے پر اچھا خاصا اہتمام کیا تھا۔ ہم نے ندیدے بچوں کی طرح کھایا۔ فادر کرمس کی آنکھیں ٹمٹمائیں۔ اسے معلوم ہو گیا کہ کھانا کھا چکنے کا ہم نے جھوٹ بولا تھا۔

چار بجے ہم فادر کرمس کے نوکروں سے سامان اٹھوا کر بس کے اڈے پر پہنچے۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس کے آثار نہ تھے مگر ہمیں بڑی سڑک پر ایک اور لاری مل گئی جو خوشاب تک جا رہی تھی۔ یہی ہمارا مدعا تھا۔ ہم وہاں سے پانچ بجے شام چلنے والی مسافر گاڑی پکڑ کر ملکوال جانا چاہتے تھے۔ ملکوال سے ساڑھے گیارہ بجے رات ہم "چناب" پکڑ سکتے تھے۔

ہم خوشاب کے اڈے پر اس وقت پہنچے جب پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔

ہم نے سڑک پر سے مسافر گاڑی کو اسٹیشن پر کھڑے اور بے صبری سے "کوکیں" مارتے سنا تھا۔ کیا ہم اس بھاگ دوڑ کے بعد اس گاڑی کو پکڑ لیں گے؟ بس سے اترتے ہی ہم نے سامان کو ایک تانگے میں رکھا اور بھاگم بھاگ سٹیشن پر پہنچے۔ پانچ میں دو منٹ! اور ہم نے گارڈ کی تیز وسل کی آواز سنی۔

ہم اس گاڑی میں سوار کیا ہوئے' کود گئے اور جب وہ پانچ بج کر پانچ منٹ پر خوشاب کے پلیٹ فارم پر حرکت کرنے لگی تو میں اور اپی کیورس اپنے سامان سمیت بچوں کی طرح خوش اس کے ایک انٹر کلاس کے ڈبے میں متمکن تھے۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ ہم تو گاڑی سے تقریباً رہ گئے تھے۔

ہم نے سگریٹ سلگائے اور بھوری پہاڑیوں کی طرف طمانیت سے دھواں اڑانے لگے۔

بھوری پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ

یہ مسافر گاڑی شاید دنیا بھر کی گاڑیوں میں سب سے آہستہ رفتار تھی۔ یہ زریں سہ پہر میں چھک چھکاتی اس کاہلی اور آلکسی سے چل رہی تھی جیسے اسے کسی خاص منزل پر نہ جانا ہو بلکہ یہ بوڑھی گاڑی گلابی پہاڑیوں کے نیچے چٹیل سیاہ ترائی کے میدان میں اچھلتی اور کودتی چلنے اور بھاگنے کی درمیانی کیفیت میں مبتلا تھی۔

ترائی ایک مستقل دلچسپیوں کی تصویروں کا البم تھی۔ آدمی اسے دیکھتا دیکھتا سیر نہ ہوسکتا۔ ابھی تمہارے سامنے ایک اونچی گھاس اور سبزے کی چراگاہ ہوتی۔ دوسرے لمحے ایک سیاہ بے آب وگیاہ چٹیل میدان تمہارے سامنے آجاتا اور اس کی ویرانی تمہارے خون کو برف کردیتی۔ پہاڑی نالوں نے اترائی کو جابجا چھیدا ہوا تھا اور برساتی پانی کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ ریلوے لائن کے آس پاس بن گئے تھے۔ جوں جوں شام قریب آتی گئی ترائی ایک ہولناک حسن کا روپ اختیار کرتی گئی "وودرنگ ہائٹس" کے "مور" بھی ان میدانوں سے زیادہ اداس نہ ہوں گے کبھی کبھی تم کاشت زدہ زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ دیکھتے۔ اس کے گرد پتھر کی دیواروں کی باڑ ہوتی تاکہ فصل پہاڑی نالوں سے بچ سکے مگر بیشتر زمین ریتلی تھی اور اس پر ہل نہ چلا تھا اپی کیورس نے مجھے بتایا کہ اگر حکومت ذرا تخیل سے کام لے تو اس ترائی میں شاندار جنگلات اگائے جاسکتے ہیں اب اس میدان میں اکا دکا خال خال درخت تھے اور لوگوں نے جنگلوں کو کاٹ کاٹ کر ختم کردیا تھا۔

تاہم عجیب بات یہ تھی کہ گو ترائی بظاہر آدمی اور حیوان کے لیے روزی اور پرورش کے ذرائع مہیا نہ کرتی تھی۔ مگر انسان یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ ہم نے کئی ایک اچھے خاصے گاؤں اور قصبے دیکھے ...... برساتی نالوں کے ریتلے کناروں پر پتھر اور گارے کے بڑے گنڈ مڈ سے دلفریب گاؤں' وہ اپنی پیچدار گلیوں اور اونچے مکانوں کے ساتھ بھڑوں کے چھتے لگتے تھے۔ کتنے خوش قسمت تھے وہ لوگ جو ان قصبوں میں بودوباش رکھتے تھے۔ ان کی پتھریلی حویلیوں میں رہتے تھے۔ ان کی تنگ ٹیڑھی ناہموار گلیوں میں چلتے تھے۔ آدمی کو ان لوگوں کی خوش نصیبی پر رشک آتا تھا۔ کیونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ آدمی ایسی جگہوں میں رہے اور اس کا دل خوشی سے دور ہو۔ ہمارے ڈبے میں نیکر اور کھلے کالر کی قمیض میں ایک سکول ماسٹر سفر کررہا تھا۔ اس کا چہرہ پتلا مگر شاداں تھا۔ وہ چھٹیوں پر اپنے بیوی کے ہمراہ اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا۔

وہ راستہ بھر ایک دوست سے باتیں کرتا رہا۔ جن کی بھنک ہمارے کانوں میں کبھی کبھار پڑجاتی۔ اس نے کئی ایک سیانی اور ہنسانے والی باتیں کہیں اور اپنے بیشتر ہم پیشوں کے برعکس ایک سمجھدار پرمذاق اور شستہ نوجوان تھا۔ ایک اسٹیشن پر اس شخص نے ہمیں چھوڑ دیا۔ گاڑی کے اسٹیشن سے باہر آجانے کے بعد ہم نے اسے دیکھا۔ وہ اور اس کی بیوی دیہاتیوں کے ایک گروہ کے ساتھ نیلے جھٹپٹے میں ایک پہاڑی نالے کے راستے کے بیچوں بیچ رواں تھے...... ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں نالے کی ریت گویا پسے ہوئے لعلوں کی خاک تھی۔ ان کا خوبصورت گاؤں' پہاڑیوں کے دامن میں ہمیں بے انتہا سحر آگیں لگا۔ مجھے یقین ہے اس کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے سکول ماسٹر کا دل گاتا ہوگا۔ قابل رشک آدمی! کاش میں وہ سکول ماسٹر ہوتا اور اس گاؤں کو اپنا وطن کہہ سکتا۔ پھر میں

نے سوچا میرا اپنا گاؤں بھی پہاڑیوں کے دامن ہی میں ہے اور کوئی کم خوبصورت نہیں ہے۔

سفر میں بعض لوگوں کی خود پرستی اور دوسروں سے بے اعتنائی کی ایک مثال دیکھنے میں آئی جس نے اس وقت تو ہمیں ہنسایا مگر اب اس کی یاد آتی ہے تو غصہ محسوس ہوتا ہے۔ گاڑی میں ایک مسجع مقطع پیر اپنے بے شمار مریدوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ دو اسٹیشنوں پر اس نیک آدمی نے پلیٹ فارم پر اپنے مریدوں اور دوسرے مسافروں کی جماعت کو نماز پڑھائی اور گاڑی اس کے بغیر نہیں چل سکی۔ اس کے مقتدیوں کے ایمان البتہ اتنے پختہ نہ تھے۔ وہ نماز پڑھتے ہوئے بھی گاڑی پر چوری کی ایک نگاہ ڈال لیتے تھے...... بے چارے گارڈ کو مجبوراً اس وقت تک گاڑی کو ٹھیرانا پڑتا جب تک کہ پیر اور اس کے مرید نماز سے فارغ نہ ہو چکتے نماز یقیناً ایک اچھی چیز ہے اور پلیٹ فارم پر اتنے دیندار لوگوں کی باجماعت نماز۔ ایک روح پرور منظر ہے لیکن کیا اس پیر کے لیے یہ بہتر نہ تھا کہ وہ اپنی پارسائی اور خدا شناسی کا یوں دکھاوا نہ کرتا؟ دوسرے مسافر جنہوں نے ڈبے ہی میں نماز پڑھ لی تھی اسے اور اس کے نمازیوں کو گاڑی لیٹ کرنے پر کوس رہے تھے میں نے اپنی کیورس سے کہا کہ اگر میں اس گاڑی کا گارڈ ہوتا تو گاڑی ٹھیک وقت پر چلا دیتا۔ تب مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اپنی نماز توڑ کر ڈبوں کی طرف بھاگتے اور اس سے ان لوگوں کو قومی ذمہ داری کا ایک ایسا سبق مل جاتا جسے وہ جلد نہ بھول سکتے۔

ترائی کے میدانوں اور پرلی پہاڑیوں پر رات پڑ گئی تھی۔ کھیوڑہ دور نیلی پیلی روشنیوں کا انبوہ تھا...... آٹھ بجے گاڑی ملکوال جنکشن میں داخل ہوگئی۔ ہمارے سید وشریف کے سفر کی تیسری منزل اختتام پر تھی۔

پہاڑیوں کے اوپر اور دور دور

چناب کے آنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے ملکوال پر پاکستانی شرفاء کے کمرے میں کھانا کھایا۔ اس کی ہر چیز حقیقی اور ہوائی تھی۔ پاکستانی شرفا کے لیے یہ ریلوے کا اسٹینڈرڈ کھانا ہے...... باسی پلاؤ کی ایک پلیٹ' آلو گوشت کا سالن اور فیرنی کی ساسر۔ مجھے شک ہے کہ اسے ریلوے اپنی خاص خفیہ ترکیب سے تیار کراتی ہے اور پھر اسے ایک کتاب کی طرح ہزاروں جلدوں میں شائع کر دیا جاتا ہے' تم اسے لاہور میں کھاؤ یا لالہ موسیٰ میں' اس کے ذائقے میں ذرا بھی فرق نہ ہوگا۔ یہ تمہاری اشتہا کو مطمئن نہیں کرے گا۔ بلکہ اسے گویا ایک کند اوزار سے قتل کر دے گا۔

چناب کا انٹر کلاس کا مردانہ ڈبہ مسافروں اور اسباب سے لبالب ٹھنسا ہوا تھا۔

ساری گاڑی میں لے دے کر ایک یہی ڈبہ تھا۔ ایک مردانہ ڈبہ اور بھی تھا لیکن وہ چند زبردست اور دلیر خواتین کے تصرف میں تھا۔

ریلوے اسٹاف کی سب دھمکیاں اور منتیں ان خواتین سے ڈبہ خالی کرانے میں ناکام رہیں۔
رش کی حالت دیکھ کر ہمارا جی بیٹھ گیا مگر قلیوں نے ہماری ہمت بندھائی۔ انہوں نے پہلے تو جوں توں کر کے بند دروازے کی کھڑکی سے ہمارا سامان اندر پھینکا اور پھر سامان کے بعد ہماری باری آئی اور قلیوں نے ہمیں باری باری اٹھا کر دروازے میں سے اندر گھسیڑ دیا۔ کافی عرصے تک ہمیں پتہ نہ لگ سکا کہ ہم کون سے ہیں اور ہمارا اسباب کونسا۔ آدمی آدمی پر چڑھا بیٹھا تھا۔ بعض لوگ دوسرے لوگوں کی گود میں بیٹھے تھے۔ بعض اسباب کے اوپر اٹکے ہوئے تھے اور میں نے کم از کم ایک ایسا مسافر بھی دیکھا جس کے اوپر اسباب بیٹھا ہوا تھا...... اپی کیورس اور میں ٹرنک پر رکھے ہوئے ایک بستر کے اوپر بڑے غیر آرام دہ طریق پر ایک دوسرے سے ٹیک لگائے بیٹھ گئے۔ میری گود میں ایک سوئے ہوئے بچے کے پاؤں تھے۔ بعض وقت وہ بچہ پاؤں پھیلا کر میرے پیٹ کے نچلے حصے میں مارتا میں غصے میں دانت پیستا اور خواہش کرتا کہ کاش میں اس بیہودہ لونڈے کو اٹھا کر باہر پھینک سکتا مگر یہ ناممکن تھا کیونکہ بچے کے ساتھ اس کا مالک بھی تھا (وہ بچے کے پیٹ پر ٹانگیں رکھے اونگھ رہا تھا)
''چناب'' گھٹا ٹوپ اندھیرے میں فراٹے بھرتی چلتی رہی۔ یہ ایک مستقل اذیت کی رات تھی...... ایک اسٹیشن پر کھلی کھڑکی میں سے ایک پاگل اندر پھلانگ آیا۔ وہ الف ننگا تھا اور اس کے پتلے جسم پر میل کی تہیں جم جم کر اس کی جسم کی رنگت اختیار کر چکی تھیں۔ لمبوترا چہرہ جھکی ہوئی مونچھیں اور اونچی فراخ پیشانی۔ میرا خیال ہے وہ پاگل ہونے سے پہلے کسی قسم کا پروفیسر تھا۔ وہ اپی کیورس کے ساتھ بستر پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ ہم نے اسے آگے نکل جانے پر اکسایا۔ وہ ایک مسخرا سا تھا اور اس کے پاگل پن کا باقاعدہ ایک اسلوب تھا۔ بعض وقت وہ تیر کی طرح کھڑا ہو جاتا اور پاؤں ملا کر سلیوٹ کرتا۔ بعض وقت وہ اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھا لیتا اور اس کے گھٹنے کو پکڑ کر دوسری ٹانگ پر بچوں کو محظوظ کرنے کے لیے گھومتا۔ اب وہ اپنی انگلیوں کو ہوا میں چٹخاتا اور اب اپنے کو ایک ناچنے والی عورت تصور کر کے ہاتھوں کے اشارے سے ایک بڑے سنجیدہ انداز میں ناچتا اور اپنے پاؤں فرش پر مار کر غیر مری پازیبوں کی چھنک سنتا ......اس پاگل کے آجانے سے ہماری مصیبت کا پیالہ بے شک اتنا بھر گیا جتنا کہ خواہش کی جا سکتی تھی...... تین چار اسٹیشنوں کے بعد وہ ہمارے ڈبے میں سے خود ہی باہر پھلانگ گیا۔ کیا وہ واقعی پاگل تھا یا بن رہا تھا؟ اگر وہ پاگل ہی تھا تو ایک معصوم بے ضرر پاگل تھا جس کی حرکات چھوٹے بچوں کی ہنساتی تھیں۔ وہ ان خطرناک پاگلوں میں سے نہیں تھا۔ جن کی دیوانگی طاقت حاصل کرنے یا روپیہ جوڑنے کی ہوس کا روپ دھار لیتی ہے اور جو اپنے حقیر فائدے کے لے ہزاروں اور لاکھوں جانوں کو قربان کرنے سے نہیں چوکتے۔ نہیں یہ بے چارا ننگ دھڑنگ انسان تمہارے افسروں اور سیاست دانوں اور سٹہ بازوں سے زیادہ ہوشمند تھا۔ اس کی دیوانگی ایک

معصوم ڈگر پر چل نکلی تھی۔

جب گاڑی راولپنڈی پہنچی تو عمل چار بجے کا ہوگا۔ یہاں تقریباً سارے مسافر اترے ہوئے معلوم ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے راولپنڈی تہذیب کی آخری سرحد ہو اور کسی کو اس سے آگے جانے میں دلچسپی نہ ہو...... ماسوا چند سر پھری دلیر روحوں کے ڈبے کے خالی ہوتے ہی ہم نے بستر کھول کر جمادئے اور لمبی تان کر سو گئے۔ میری آنکھ کھلی تو سورج بڑی دیر کا نکل چکا تھا اور گاڑی عنبر کی رنگت کی چٹانوں کے دیس میں پف پف کر رہی تھی۔

ہم نے گاڑی میں ناشتہ کیا۔ نو بجے کے قریب ہم اٹک کے پل پر سے گزرے دریائے سندھ نیچے چٹانوں میں سے بل کھاتا ہوا۔ اور شہر اپنے پتھریلے مکانوں کے ساتھ ایک چٹان پر بنا ہوا اپی کیورس نے اس کے قلعے کی طرف اشارہ کیا۔ زمین اب قدرے سیاہی مائل تھی اور میرا خیال ہے کہ زرخیز ہوگی۔ گاؤں بہت سے تھے۔ ہمیشہ ڈھلانوں پر امڈتے ہوئے۔ ان کے کوچے چوڑے اور کھلے تھے۔ ہر ایک کے بیچ میں چار برجوں کا ایک مٹیالا قلعہ تھا۔ یہ ہمیں یاد دلاتا تھا کہ یہ اس بہادر جنگجو قوم کی سرزمین تھی جس کی تاریخ قبائلی خونریزیوں اور اپنی آزادی کے لیے لڑائیوں سے پر تھی...... مضطرب، مضبوط، پٹھانوں کی سرزمین جن کے مزاج ہلکے سے ہلکے حملے سے بھی بھڑک اٹھتے اور وہ برافروختہ ہو جاتے تھے۔ کئی سو برس سے قبائلی احساس اور غرور ان میں زندہ تھا۔ اس غرور نے ان کے بہادر، بے پروا کردار کی تشکیل کی تھی۔ یہ قبائلی غرور اب بھی مرا نہ تھا اور پرانی عداوتوں کو قبیلوں نے ابھی بھلایا نہ تھا۔

گاڑی کے کھلے دروازے کے پاس ادھیڑ عمر کا ایک پٹھان بیٹھا تھا۔ اس کی ڈاڑھی میلی اور بکھری ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ قدرے زرد اور غیر صحتمندانہ طور پر گیم شیم تھا اور ہر پانچ منٹ کے بعد وہ اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک ڈبیہ نکالتا اور نسوار منہ میں رکھتا۔ وہ بار بار کھلے دروازے میں سے تھوکتا۔ شاید اسی وجہ سے وہ دروازے کو مستقلاً کھلا رکھے ہوئے تھا۔ یہ نسوار کھانے کی عادت (اور متواتر تھوکنے کی عادت) ان اچھے پہاڑی لوگوں میں عام ہے۔ اس نے میرا خیال ہے، ان کی صحتوں اور کرداروں پر برا اثر ڈالا ہے اور شاید آج کل کے نوجوان پٹھان اپنے جفاکش اسلاف سے قد میں قدرے چھوٹے رنگت میں پیلے، طاقت میں ہیٹے ہو گئے ہیں۔ ایک آدمی تمباکو کیوں کھائے یا اسے مٹھیاں بھر بھر کر اپنی ناک میں کیوں گھسیڑے جب وہ اسے ایک پائپ یا سگرٹ میں بھی پی سکتا ہے اور دھوئیں کے مرغولوں میں خوشی کے خواب دیکھ سکتا ہے؟

یہ آدمی خٹک قبیلے کا تھا (جیسا کہ ہمارے پوچھنے پر اس نے ہمیں بتایا) چودہ سال پہلے اس نے اپنے کوہستانی پہاڑوں کو چھوڑا تھا

اوراس مدت میں ایک بار بھی اس نے ان کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے دنیا میں کسی کاروبار میں روپیہ کمایا تھا لیکن (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) صحت کھو بیٹھا تھا اور اب مایوس ہو کر اس امید سے اپنے وطن کو لوٹ رہا تھا کہ کیٹیلی پہاڑی ہوا اور صاف "آہنی" پانی پھر اس کی رگوں میں خون کی حدت کو تازہ کردیں گے اور اس کے جسم (اور روح) کے ان گنت عوارض کو دور کردیں گے۔

"تم اپنا وطن چھوڑ کر کیوں گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا "یہاں کام کوئی نہیں۔ زمین ظالم ہے اور کچھ نہیں اگاتی۔ میں روزی کے لیے باہر نکل پڑا۔ اور میں نے حیدرآباد میں کاروبار میں بہت روپیہ کمایا ہے۔ اب میں امیر آدمی ہوں۔"

"لیکن تم نے اپنی صحت کھودی ہے" میں نے کہا۔

"یہ سچ ہے" اس نے سوچ کر کہا "مگر روزی کا سوال تھا......" اور پھر اس نے کھڑکی میں سے زریں وحشی چٹانی ڈھلانوں کو اپنی عقابی سخت آنکھوں سے تکتے ہوئے کہا۔ (ان آنکھوں میں اس وقت ایک نرمی سی آگئی) "میرے وطن جیسا دنیا میں کوئی وطن نہیں ہے۔ ایسی ہوا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ یہاں کا پانی اکسیر ہے...... سراسر صحت ہے تم اسے پیو تو تمہارے اندر لوہا بھی ہو تو ہضم ہو جاتا ہے۔ اگر مجھے یہاں روزی مل جاتی تو میں یہاں سے کبھی بھی نہ جاتا۔ ایسی جگہ سے کون جائے۔ ایسی ہوا کو کون چھوڑے ...... میں نے روپیہ کما لیا ہے مگر سندھ میں صحت برباد کرلی ہے۔ وہاں کا پانی بڑا خراب ہے۔ وہاں جتنی اچھی خوراک کھاؤ اتنی ہی بد ہضمی اور پیچش پیدا ہوتی ہے۔"

"کیا تمہارے وطن میں تمہاری تھوڑی بہت زمین نہ تھی؟"

"دو ایکڑ زمین تھی لیکن اس سے کیا بنتا تھا۔"

"ایک آدمی اس پر زندہ رہ سکتا ہے۔" میں نے کہا

"تم ابھی ایک نوجوان لڑکے ہو" ادھیڑ عمر پٹھان نے کہا۔

ہم نے پھر اس سے سوات جانے کے راستے کے بارے میں پوچھا۔ کیا ہمیں نوشہرہ اترنا چاہیے یا آگے پشاور جانا چاہیے۔ ان علاقوں سے اتنا عرصہ دور رہنے کی وجہ سے وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے اپنے چند رشتہ دار یاد تھے جو پرے پہاڑوں میں پیر بابا کے مزار پر گئے تھے۔ وہ پشاور سے چارسدہ کو روانہ ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ اسے پتہ نہ تھا۔ اور شاید اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ وہاں سوات کے نام کی کوئی جگہ ہے۔ وہ اپنی گٹھریوں کے ساتھ اکوڑہ خٹک کے اسٹیشن پر اتر گیا۔ چودہ سال کے بعد اپنے وطن کے پلیٹ فارم پر

پہلی بار کھڑے ہو کر اور اس آشنا صحت افزا ہوا میں سانس لے کر اس کے احساسات کیا ہوں گے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ وہ زیادہ تخیل سے مالا مال نہ تھا۔ دنیا کی حقیقتوں نے اسے عملی' عیار اور تنگ دل بنا دیا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ چاندی کی لعنت اس پر پڑ گئی ہے۔ اس لعنت سے زیادہ روح اور نیک جذبے کو کچلنے والی کون سی چیز ہے۔"

اکوڑہ خٹک کا گاؤں...... خوشحال خاں کا خٹک...... (جیسا کہ اپی کیورس نے مجھے یقین دلایا) ایک اونچے ننگے سرخ پہاڑ کی ڈھلان پر ہے یہ مجھے ایک شیر کی کچھار کی طرح لگا۔ اس جگہ میں نے سوچا...... اکبر اور اورنگ زیب کے مغل اور راجپوت شاہسواروں اور بہادر پٹھان قبیلوں میں کتنے ہی معرکے ہوئے ہوں گے۔ مغل توپ خانے یہاں گونجے ہوں گے اور چٹانیں خون سے لال ہو گئی ہوں گی...... اقبال کی شاعری نے خوشحال خاں کے نام کو ایک دوست کے نام کی طرح آشنا کر دیا ہے...... ایک آتشیں شاعر...... بہادر سپاہی...... اور مغرور محب وطن...... خوشحال ان وحشی پہاڑیوں کی آزاد روح کو اپنی ذات میں مجسم کیے ہوئے ہے۔ یہ سادہ پٹھان فولاد کی طرح سچا' چٹان کی طرح کڑیل اور بلبل کی طرح نغمہ گو تھا...... سب اچھے آدمیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ تم اسے سن کر محسوس کرتے تھے کہ زندگی کو اسی طرح بسر کرنا چاہیے...... اکوڑہ خٹک کے اسٹیشن پر ہم نے تین چار بچے دیکھے جو ہار بیچ رہے تھے۔ پٹھانوں کو پھولوں سے بڑی محبت ہے۔ اپی کیورس نے اس جگہ کی نشانی کے طور پر چنبیلی کے چند ہار خریدے اور انہیں میرے گلے میں ڈال دیا۔

پھر ہم نوشہرہ پہنچ گئے۔ یہاں ہم اترے...... کیا ہمیں سیدو جانے کے لیے یہیں اترنا چاہیے تھا؟ ہمیں اس کے بارے میں یقین نہ تھا۔ نہ ہی ہم نے کسی سے پوچھا بلکہ سیدھا سامان اٹھوا کر تانگے کے اڈے پر آ گئے۔

تانگے کا کوچبان ایک روکھا پھیکا پٹھان تھا...... بڑا نا خوشگوار اور بڑا کڑوا۔ اسے ہمیں لے چلنے کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ وہ ہمیں گستاخ مضحک نظروں سے دیکھتا رہا۔ جب قلی نے سامان اس کے تانگے میں رکھ دیا تو وہ چلنے سے پہلے ہم سے کرایہ طے کر لینا چاہتا تھا۔

"لاری کے اڈے تک دو روپیہ لے گا" اس نے درشتی سے کہا۔

اس کے لہجے میں کوئی ایسی چیز تھی کہ ہماری کنپٹیوں میں خون جمع ہو گیا۔ جی میں آئی۔ اس کا تانگہ نہ لیں لیکن اب ہم اس میں سوار ہو چکے تھے۔ ہم غصے کو پی گئے۔

"دو روپے ہی دے دیں گے۔ چلو" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اس شخص نے غالباً یہ دیکھ کر کہ دو روپوں پر ہم نے آنکھ تک نہ جھپکی تھی اور اس کی مانگی ہوئی اجرت دینے پر فوراً تیار ہو گئے تھے۔ ہمیں شاید امیر زادے سمجھا۔ اس نے شاید یہ بھی بھانپ لیا کہ ہم نو وارد تھے۔ اس نے اب ہمیں نصیحت کی کہ ہم سوات جانے کے لیے ویگن کرایہ پر لے لیں۔ وہ اپنی ساری باتوں میں ہمیں یہ تاثر دیتا رہا کہ سوات تک بس میں پہنچنے کا خیال انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ غالباً ویگن والوں سے اس کی کوئی ''اٹ سٹ'' تھی۔ میں نے اس سے پوچھا ''ویگن کا پورا کرایہ کیا ہوگا۔'' وہ حیران رہ گیا جیسے ہم سے ایسا سوال سن کر اسے بڑا صدمہ پہنچا ہے اس نے کھرے انداز میں کہا ''میں نہیں جانتا۔'' ہم سڑک کے کنارے ایک بڑے سے شیڈ کے پاس پہنچے۔ چار پانچ ٹوٹی پھوٹی ویگنیں یہاں کس مپرسی کے عالم میں کھڑی تھیں کوچبان نے کہا ''ایک اڈہ یہ ہے۔ ہم تانگہ کو ادھر کھڑا کرتا ہے۔ آپ ویگن والوں سے بات کر آیئے۔''

''ہمیں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر لے چلو'' ہم نے ٹھسے سے کہا۔

یا تو ہم سے وہیں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا یا وہ ویگن والوں کے لیے مسافر لا کر ان سے کمیشن بتیانا چاہتا تھا...... میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر ہمارے جواب نے اسے بے حد خفا کر دیا۔ اس سے ہمیں خوشی ہوئی۔ میں نے اس کے چہرے پر خون کی چھلکاہٹ دیکھی۔ اس کی گھنی مونچھیں اینٹھیں۔

''آپ لوگ خراب ہوگا'' اس نے جھلاہٹ میں کہا ''ہمارا بات مانو۔''

''گورنمنٹ بس کے اڈے پر چلو'' اب میں اس کی خفگی کا لطف اٹھانے لگا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ہم نے اس کے قابل قدر مشورے کو درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ اسے بڑا صدمہ ہوا۔ وہ ہمارے خلاف غصے سے دل ہی دل میں کھولتا رہا اور بالکل چپ اور زیادہ روکھا ہو گیا اور گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے تک وہ ایک لفظ نہ بولا۔ نہ ہی ہم نے اس سے کوئی مشورہ لیا۔

نوشہرہ ایک چمکیلا مسکراتا ہوا شہر ہے اور سرحد کے اکثر شہروں کی طرح ایک ماڈرن' ستھری ''لک'' رکھتا ہے۔ اڈے پر پہنچ کر ہم نے اس بگڑے دل کوچبان کو پیسے دیئے۔ اس کی خفگی ابھی تک اس کی کنپٹیوں میں تھی اور وہ ہمیں قاتلانہ نگاہوں سے گھورتا تھا۔

اڈہ ایک ڈھلانی برآمدے کی لمبی پتھر کی عمارت تھی۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی نیلی بسیں اس کے سامنے قطار اندر قطار کھڑی تھیں اور یہ جگہ ایک ریلوے اسٹیشن کی طرح مصروف اور پر رنگ تھی۔ اپنی کیورس غائب ہو گیا۔ پھر وہ یہ پتہ لگا کر آیا کہ سیدو شریف کو لاری مردان سے چلتی ہے۔ (کسی کو یقین نہ تھا) مگر مردان کو جانے والی بس آدھ گھنٹے پہلے نکل چکی تھی...... خوش قسمتی سے ایک اور مقامی ٹرانسپورٹ کمپنی کی بس مردان جانے کے لیے تیار ہمیں مل گئی۔ برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا ہوا ایک منشی اس کے رنگین ٹکٹ بیچ رہا

تھا۔ اپی کیورس ٹکٹ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم سامان کو اوپر رکھوا کر بیٹھ گئے اور جلدی ہی ہم مردان کی سڑک پر تھے۔

مردان کی سڑک کے دو رویہ پیلے کھیت اور زمردیں درخت لہلہاتے ہیں۔ زرد گلاب کی پہاڑیاں چاروں طرف سے گھرتی آتی ہیں۔ گویہ اپریل کا آخر تھا۔ یہاں ابھی گندم کی کٹائی نہ ہوئی تھی اور سنہری خوشے ہوا میں غرور سے ہلتے تھے۔ بہار کا سانس ہر بیل اور ہر بوٹے۔ ہر پھول اور ہر پتی کو چھو رہا تھا۔ سڑک تدریجی طور پر اوپر پہاڑوں کی طرف چڑھتی تھی۔ لیکن تم چڑھائی سے آگاہ نہ ہوتے تھے۔ ہمارے دل گانے لگے اور اپی کیورس مضطرب اور خوش بار بار رنگی ہوئی پہاڑیوں کی طرف اشارے کرتا۔ مردان میں داخل ہونا اتنا اچھا تھا کہ ہمیں یقین نہ آیا۔ ہم اس کے عمدہ بازار میں گزرے اور پھر لاری نے ایک چوڑے پارک کا چکر کاٹا جس میں ایک قسم کا مانومنٹ تھا اور پھیری والوں کو دوکانیں اس کے چاروں طرف رنگوں کے بھڑکتے نمونے تھے!...... اور پھر ہم ایک اڈے کے پاس سے گزرے۔ ایک لاری وہاں کھڑی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ''سیدو شریف'' پڑھا'' میرا دل اچھلا۔ یہ ہمارا جادو کا قالین تھی۔ مسافر اس میں بیٹھ رہے تھے اور اس کی چھت پر سامان رکھا جا رہا تھا...... ہماری بس کچھ آگے جا کر رکی اور ہم دھڑکتے ہوئے دلوں سے سامان اتروا کر سیدو شریف کی لاری کے اڈے کی طرف دوڑے ہمیں ڈر تھا کہ کہیں چل نہ دے۔ (یہ دو گھنٹے بعد چلی)...... اپی کیورس نے ایک جگہ منگورا کے ٹکٹ خریدے۔ میں نے سامان چھت کے اوپر رکھوایا۔ لاری کے پاس ایک آدمی جو ایک بوسیدہ بھک منگا لگتا تھا' مگر دراصل اس بس سروس کا کوئی اہم عہدیدار تھا۔ پشتو میں چلا چلا کر ہر کس و ناکس کو منگورا چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ لوگ کتنے بذوق ہیں کہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتے...... اس عہدیدار نے غالباً ہمارے لباس سے یہ جانتے ہوئے کہ ہم کوئی عام مسافر نہ تھے۔ اپی کیورس اور میرے لیے فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھولا ''ادھر بیٹھو'' پھر اسے خیال آیا کہ ہم دو تھے اور نشست ایک۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور پچھلی نشستوں کی سمت اشارہ کیا۔ اس کو کچھ یاد آ گیا۔ اس نے کہا کہ فرنٹ سیٹ ایک کالج کے پروفیسر کے لیے ریزرو ہے (یہ کالج کا پروفیسر ایک افسانوی پروفیسر تھا۔ وہ آخر تک نمودار ہی نہ ہوا) ...... ہمارے بیٹھ جانے کے تھوڑی دیر بعد یہی عہدیدار (اسے دیکھ کر ذہن میں کفن چور ابھر آتے تھے) پیچھے سے اندر آیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا'' کیا بات ہے؟''

''پانچ روپیہ اور دو۔'' اس نے کہا۔'' آپ نے سامان کا کرایہ نہیں دیا۔''

اپی کیورس اس وقت اتنا خوش تھا کہ اسے روپے کی پروا نہ تھی۔ وہ عہدیدار کو پانچ روپے دینے پر تیار ہو گیا لیکن میں بھانپ گیا کہ یہ شخص چالاکی سے ہم سے رقم اینٹھنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ سختی برتی۔

''ہم بسوں ہی کے ذریعے یہاں تک پہنچے ہیں۔''میں نے اسے بتایا۔''اور ہمیں کہیں بھی سامان کا کرایہ ادا نہیں کرنا پڑا۔''

''اچھا تین روپیہ دو۔''

''کیوں؟''میں نے پوچھا...... وہ تھوڑی دیر متامل کھڑا رہا...... ایک مکار بھک منگے کا انداز اپنی آنکھوں میں لیے اور پھر یہ دیکھ کر کہ ہم اتنے سادہ لوح نہ تھے کہ اس کے جھانسے میں آجائیں' وہ چلا گیا۔ بلاشبہ اگر ہم اسے رقم دیتے تو وہ اسے خود اپنی جیب میں ڈال لیتا اور ہمیں رسید دینے کی ضرورت نہ سمجھتا۔ ایک غریب مانگنے والے کو کچھ دینا اور چیز ہے اور اس طرح الو بن کر اپنی نقدی سے ہاتھ دھو بیٹھنا بالکل مختلف چیز ہے اور وہ آدمی ایک ناتجربہ کار مسافر ہے جو سفر میں اپنے بٹوے پر دھیان نہیں رکھتا۔ وقت گزرتا گیا۔ لاری اسی طرح کھڑی رہی۔ کفن چور اب بھی ہانک پر ہانک لگائے جا رہا تھا''منگورا چلو منگورا''میں نے اپی کیورس سے شکایت کی کہ بس چلتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس نے کلبی بن کر کہا کہ اسے اس کی کوئی فکر نہیں اور وہ اس لاری میں ایک سال انتظار کر سکتا ہے۔

لاری میں مسافر بھر چکے تھے اور جب سب نشستیں پر ہو چکیں تو لکڑی کے تختے نشستوں کے بیچوں بیچ جوڑ دیئے گئے۔ مزید مسافران پر بیٹھ گئے۔ کفن چور ابھی تک''منگورا' منگورا''چلا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ابھی چھت پر جگہ باقی ہے...... کچھ وقفے کے بعد اپی کیورس بھی لاری کے چلنے سے مایوس ہو گیا۔ اس نے اپنا سفری جرنل نکال لیا اور اڈے پر اپنے تاثرات پنسل سے تحریر کرنے لگا۔

بس کے اندر اور باہر سوات اور سیدو کی فضا تھی۔ مسافر گول طلے دار سواتی ٹوپیوں میں جفاکش پہاڑیئے تھے۔ ان میں سے بیشتر سلیٹی ملیشیا کی شلوار قمیص میں ملبوس تھے بعض مونج کے سلیپر پہنے تھے۔ افغانوں کی طرح وہ بھی بڑے تمبا کو کھانے والے تھے اور بڑے تھوکنے والے بھی۔ ایک جوان آدمی جو ہماری پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اپنے ساتھی سے پشتو میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ ایک خوش باش' بے پروا اور شیخی خورہ نوجوان تھا (جیسا کہ ہم میں سے بیشتر اپنی جوانی میں ہوتے ہیں) بعد کے ایک واقعہ سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے دوست کو محبت کی وادی میں اپنا دل ہار دینے کا قصہ سنا رہا تھا ایک چھوٹا بچہ گلے میں خوانچہ لٹکائے آیا۔ اس نے رنگا رنگ ازار بند اور پراندے دیکھے اور پھر بڑی احتیاط سے اور اپنے دوست سے مشورہ لے کر ان میں سے ایک کو پسند کیا...... تم اب ساری کہانی مکمل کر سکتے ہو...... میں ایک لفظ نہ کہوں گا۔

پورے بارہ بجے ڈرائیور لاری میں آ بیٹھا (کفن چور کے ڈرائیور ہونے کے بارے میں میرا وسوسہ غلط ثابت ہوا اور تھوڑی بہت جھوٹی خبرداریوں کے بعد ہم واقعی روانہ ہو گئے۔ ہم الٹے پہیوں پارک اور میموریل کی طرف گئے۔ مردان سے باہر نکل آئے اور پھر

فیکٹری کے بڑے پھاٹک پر آ رکے۔ یہاں ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے ہوئے چند کاروباری آدمیوں کو اپنے مال کے بورے لاری پر لدوانے تھے۔ اس عمل نے پورا ایک گھنٹہ لیا۔ بوروں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ ساری فیکٹری چھت پر لادی جا رہی ہے۔ تعجب یہ تھا کہ چھت اتنے سارے بوجھ کے نیچے چیں نہ بول گئی۔ قدرتی طور پر ایک قنوطی ہونے کی وجہ سے میں ہر لمحہ چھت کے بیٹھ جانے کی توقع کر رہا تھا اور جب بڑی دیر تک یہ حادثہ نہ ہوا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں ان بیوپاریوں کو اپنے گٹھوں کے نیچے دبے دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ خدا خدا کر کے ہم وہاں سے چلے...... یہ خطہ اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا جس سے ہم آئے تھے۔ ہاں کھیتوں کے قطعے اب خال خال تھے اور چٹانیں قریب آ گئی تھیں...... اونگھتے ہوئے ہم نے پہاڑیوں کو دیکھا۔ لاری کے ڈرائیور کی سامنے کے تختے پر ہدایات وغیرہ کو پڑھا۔ ان میں سے بعض بڑی مفید اور عبرتناک تھیں۔ ایک اطلاع دیتی تھی ''ایکسپریس میل آ گیا جی۔'' اس کے نیچے ایک مصرع تھا۔

''قسمت ہمارے ساتھ ہے.......... جلنے والے جلا کریں''

اس شعر کے مخاطب غالباً دوسری رقیب بس سروس کے چلانے والے تھے۔ سب سے دلچسپ ہدایت یہ تھی ''ڈرائیور کو تیز چلانے کی ترغیب نہ دیں۔'' اس سے شاید بس کمپنی کا مطلب یہ تھا کہ ڈرائیور آخر عام کمزور انسان ہوتا ہے اور تیز چلانے کی ترغیب سے فوراً اثر پذیر ہو سکتا ہے۔ کمپنی والوں کو یہ علم نہ تھا کہ اس کے ڈرائیوروں کو ترغیب کی ضرورت نہ تھی۔

یہ ڈرائیور ترغیب کے بغیر ہی لاری کو بڑا تیز چلاتا رہا اور سوئی چالیس پینتالیس کے درمیان ہلتی رہی۔ مگر وہ ایک اچھا تجربہ کار ڈرائیور تھا۔ اور تم اپنے کو اس کے ساتھ محفوظ محسوس کرتے تھے۔ کوئی دو بجے ہم درگئی پہنچے۔ ہمارے بائیں کو گھاٹی میں پانی کی بجلی کے پاور ہاؤس کی عمارتیں تھیں۔ اوپر پہاڑ سے دو آبشار چاندی کے دھارے کی طرح نیچے دریا میں گر رہے تھے۔ دریا کو پچھلی وادی سے مصنوعی طریقے سے ایک پختہ نہر کی صورت میں پہاڑ کے اوپر سدھا کر لایا گیا تھا۔ تاکہ نیچے بجلی پیدا کرنے والی مشینوں کے لیے اس سے بجلی پیدا کی جا سکے۔

مالاکنڈ ایجنسی کی کسٹم پوسٹ پر ہمیں رکنا پڑا۔ ملیشیا کے کپڑوں میں پٹھان سپاہی لاری پر چڑھ گئے اور سامان کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ اپی کیورس اور میں نے چند بچوں سے لوکاٹ خرید کیے اور انہیں ایک پل کی منڈیر پر بیٹھ کر کھانے لگے...... اپی کیورس ۔ پھر سامان کے پیچھے چلا گیا۔ ایک سپاہی اس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اپی کیورس میری طرف اشارہ کر کے اسے کچھ سمجھانے لگا۔ میرا دل ڈوب گیا۔ بے وفا غدار اپی کیورس! اس نے مجھے ''بی ٹرے'' کر دیا تھا۔

مالاکنڈ ایجنسی کی پولیس نے ساری صوبہ سرحد کی پولیس کو ہوشیار کر دیا تھا کہ محمد خالد نامی شخص کسی بس کے ذریعے (غالباً بھیس بدل کر) سیدو شریف جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہیں اسے ہر قیمت پر وہاں جانے سے روکنا تھا۔ انہیں حکم تھا کہ اس کے غدار بازوؤں پر ایک مجرم کی ہتھکڑیاں پہنا دیں اور اسے تاریک ترین تہہ خانے میں پھینک دیں...... اس کے خلاف سنگین الزامات تھے ......وہ ایک دہشت پسند کمیونسٹ تھا...... اس کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ اس نے ایک بار ایک غدارانہ کتاب لکھی تھی۔ وہ چند خفیہ اہم ملکی دستاویزوں کے ساتھ سوات کے راستے ایک کمیونسٹ ملک میں بھاگ رہا تھا۔ اس خطرناک شخص کو ہر حالت میں روکنا ضروری تھا!...... کچھ اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں سے گزرے۔

میں بس کے پاس پہنچا تو نوجوان سپاہی مجھ سے مخاطب ہوا ''آپ کا نام محمد خالد ہے۔''

''ہاں'' میں نے تعجب سے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا ''آپ'' سے مجھے کچھ امید تو بندھی تھی مگر محمد خالد نامی شخص میں کسٹم پولیس کی خصوصی دلچسپی نے میرے دل کو پھر وسوسوں سے بھر دیا۔

''اچھا میرے ساتھ آؤ۔'' نوجوان سپاہی نے کہا۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر ہتھکڑی پڑتے دیکھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں ان ناتواں بزدل انسانوں میں سے ہوں جن میں جسمانی جرات نام کو نہیں ہوتی۔ (مجھ میں اخلاقی جرات بھی کوئی زیادہ نہیں اور شاید اپنی جان بچانے کے لیے میں اپنے بہترین دوست سے بے وفائی کرنے' یا اپنے مذہب کو تبدیل کرنے اور ہر قسم کے حیلے سے کام لینے سے دریغ نہ کروں' میں اس مٹی سے نہیں بنا جس سے شہید بنتے ہیں)

نوجوان سپاہی کا رویہ بداخلاقی کا نہ تھا۔ وہ پہلے مجھے چوکی پر لے گیا۔ ایک مونچھوں والے حوالدار نے مجھ سے مزید باز پرس کی ''آپ کراچی سے آ رہا ہے نا؟'' اس نے پوچھا ''بہاولپور سے'' میں نے جواب دیا ''آپ کا والد کا نام کیا ہے؟ کیا وہ پشاور میں وکیل ہے۔'' اس نے مزید دریافت کیا ''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ حوالدار کچھ سوچ میں پڑ گیا اور پھر انہوں نے مجھے جانے دیا۔ یہ سب بڑا پراسرار تھا۔ ابھی میں اپنی نئی پائی ہوئی آزادی پر پوری طرح خوش نہ ہونے پایا تھا کہ نوجوان کانسٹبل پھر میری طرف آیا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ سامنے کے ایک پتھریلے مکان کے احاطے میں لے گیا' جہاں اخروٹ اور ناشپاتی کے درختوں کے ٹھنڈے سائے کے نیچے چارپائیاں اور کرسیاں بچھی تھیں۔ ایک میز پر لوکاٹ کی بھری پلیٹیں تھیں۔ ایک کشادہ پیشانی اور شگفتہ چہرے کا پینتالیس سال کا شخص آرام کرسی سے اٹھا۔ اس نے کچھ قدم آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور کمال خندہ پیشانی سے مجھ پر سارا قصہ واضح کیا۔ بات یہ تھی کہ میرا ایک ہم نام جو کراچی میں انجینئر تھا' آج سوات سیر کی غرض سے جانے والا تھا۔ اس کے باپ نے جو پشاور کا مشہور وکیل

تھا' اپنے دوست پولیٹکل ایجنٹ صاحب کو فون کیا تھا کہ وہ اس کے آنے کا خیال رکھیں اور اسے ریاست کی سیر میں ہر ممکن سہولت دیں۔ اس نے اس تکلیف کا جو مجھے اٹھانی پڑی تھی' معافی چاہی۔ میں اس سارے معاملے پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا...... لیکن یہ کیسا اتفاق تھا کہ دوسرا محمد خالد بھی میری طرح انجینئر تھا۔ وہ کراچی سے آ رہا تھا اور چند دن پہلے میں بھی کراچی میں تھا...... تھوڑی دیر کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں دوسرا محمد خالد بن جاؤں۔ پولیٹکل ایجنٹ کی مہمان نوازی کے مزے لوٹوں اور شاہی طریق پر موٹر میں سیدو تک جاؤں۔ یہ ایک اچھا مذاق ہوگا۔ مگر دوسرے محمد خالد کے آ جانے پر میرا پول کھل جاتا۔ ایک سچا بہروپیا بننے کے لیے جرات کی ضرورت ہے۔ ویسے میں اب بھی اکثر سوچتا ہوں کہ مجھے دوسرا محمد خالد ہی بن جانا چاہیے تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک معصوم مذاق ہوتا اور کسی کو اس سے نقصان نہ پہنچتا۔ سواتی مہم پھر دس گنا اور ''تھرلنگ'' ہوتی اور اتنی ہوشربا جتنی فلپ آپنہم کی کوئی جاسوسی کہانی۔

اس کسٹم پوسٹ سے پہاڑوں پر اصل چڑھائی شروع ہوئی۔ ہم ننگے تپتے ہوئے چٹانی چہرے پر ایک بھونرے کی طرح رینگنے لگے۔ نیچے چمکیلی دھند میں فراخ دریائی وادی تھی۔ تصویر کی طرح خوبصورت...... کئی موڑوں کے بعد ہم اوپر مالاکنڈ میں پہنچے ...... شطرنج کے رخوں کے نمونے کے قلعے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایستادہ۔ خوبانی اور لوکاٹ کے باغات' پتھر کے اکا دکا مکان' چٹانوں پر ان برٹش رجمنٹوں کے نام اور القاب کھدے ہوئے تھے جنھوں نے انگریزی راج کے ایام میں مالاکنڈ میں پڑاؤ ڈالے تھے اور سرکش قبائلیوں کو قابو میں لانے کی کوشش کی تھی۔ وہ فراعین کے اہرام کے مہیب کتبے معلوم ہوتے...... ابدی...... اور وقت سے آزاد...... تم سوچتے تھے کہ دس ہزار سال بعد بھی یہ کتبے اسی طرح ہوں گے...... وہ مالاکنڈ اور ان افغانی پہاڑوں کی تاریخ کا ایک حصہ تھے...... کیا وہ بہادر پٹھانوں کے لیے ایک مستقل ہتک نہیں؟ وہ ہیں لیکن انہیں مٹانا یا تباہ کرنا شیوہ مردانگی نہیں...... ہاں اس سنگلاخ ویرانی میں ان چھوٹے انگلستان کے جگر گوشوں کو رہنے دو۔ سو سال بعد وہ تاریخ کے طالب علموں کے لیے محض ماضی کے پر رعب نشان ہوں گے۔

مالاکنڈ سے اترائی شروع ہوئی۔ ہمارے سامنے سنہری دھند میں ایک وسیع وادی خوابیدہ تھی اور اگر دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی وادی ہے تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ بھوری لڑھکتی ہوئی سی چٹانوں پر کھیت پیلے سونے اور زمرد کی مستطیلیں تھے۔ یہ ایک ہلکے رنگین چاک سے رنگی ہوئی وادی تھی اور قوس قزح کے سارے رنگ مل کر اس میں ایک دلفریب نمونہ بنا رہے تھے۔ اس کوہستانی جنت میں دریائے سوات ایک آبدار تلوار کی طرح بھڑکتا ہوا جاتا تھا۔ بھیڑوں کے چرتے ہوئے ریوڑ برف کے متحرک گالے تھے۔ ڈھلانوں پر کہیں کہیں لکڑی کے برآمدوں کے کچے کوٹھے تھے۔

اپنی کیورس اور میں قدرت کے اتنے حسن کے سامنے گونگے ہو گئے۔ ہمارے دل تشکر سے معمور تھے۔

لاری باٹا خیل کے بڑے گاؤں میں کوئی ایک بجے داخل ہوئی۔ یہ ان دیہات میں سے ہے جنھیں قصبہ کہنا چاہیے۔ اس کا بازار لمبا اور لڑکھڑاتا ہوا ہے۔ دوکانیں اچھی خاصی ہیں اور ہر قسم کا سامان وہاں بک سکتا ہے۔ باٹا کنڈا ایجنسی میں ہے۔ لاری ایک لمبے چوڑے برآمدوں والے ہوٹل کے سامنے رکی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں لاری بہت دیر ٹھہرے گی اور ہم کھانا کھا اور ستا سکتے ہیں۔

ہوٹل کے برآمدے میں ایک لمبی میز تھی۔ اس کے چاروں طرف کرسیاں تھیں۔ اس لیے یہ ممکن تھا کہ تم وہاں کھانا بھی کھاتے جاؤ اور بازار کے منظر کی سیر بھی کرتے رہو۔ اس لحاظ سے یہ ہوٹل کسی قدر پیرس وضع کا تھا۔

ہوٹل کے ملازموں نے ہمارا خیر مقدم خوش اخلاق میزبانوں کی مانند کیا۔ یہ وہ چیز ہے جسے تم پنجاب کے ہوٹلوں میں بیکار ڈھونڈو گے۔ ہم پنجابی' ایسا معلوم ہوتا ہے سچی مسافر نوازی کی روایات سے بیگانہ ہیں۔ ہمارے ہوٹلوں میں ایک غیر شخصی سی' معاندانہ سی فضا ہوتی ہے' سرحد میں ایسا نہیں۔ یہاں کے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تم ایسا محسوس کرتے ہو جیسے تم اپنے گھر میں اپنے کنبے کے افراد اور احباب کے ساتھ کھا رہے ہو اور تمہارے اپنے گھر کے ملازم تمہاری ضروریات پوری کر رہے ہوں۔ بلاشبہ تمھیں اپنے کھانے کے دام ادا کرنا پڑتے ہیں لیکن یہ ایک محض رسمی تکلف ہے اور اتنی ستھری اور صحت بخش خوراک اور خوش اخلاقی کے صلے میں کچھ بھی نہیں۔

ان اچھے لوگوں نے ہمیں یہ محسوس کرایا جیسے ہم کوئی شہزادے ہوں اور ہماری آمد اس ہوٹل کے ہر فرد کے لیے ایک بڑی اور طرفہ عزت افزائی کی موجب ہو۔ انہوں نے ہمیں بٹھا کر آفتابے اور چلمچی سے ہمارے ہاتھ دھلائے (یہ چیز تو پنجاب میں قطعاً ناممکن ہو گی) ایک بوڑھا کھلے چہرہ والا شخص...... وہ شاید صاحب خانہ تھا...... خود ہی ہمیں ان چیزوں کی تفصیل بتانے آیا جو اس وقت تیار تھیں۔ کھانا جس وقت آیا سادہ اور گھر کا سا تھا۔ بڑے خمیری نان اور آلو گوشت ...... یہ صحت بخش تھا اور تمہارے پنجاب کے کھانے کی طرح مصالحے اور بناسپتی کی خوفناک لیپ نہیں تھا۔ خمیری نان سے زیادہ اچھی۔ زیادہ ایماندار روٹی دنیا بھر میں نہیں ہے۔

اور ان کا یہ سلوک صرف ہمیں سے نہیں تھا' بلکہ ہر غریب مسافر جو اس دسترخوان پر بیٹھا' ان کے لیے ایک ممتاز اور قابل قدر مہمان تھا۔ ایک مسافر کو میں نے دیکھا...... اٹھارہ سالہ بدحال جوان...... وہ بڑا ہی غریب ہوگا کیونکہ وہ ایک روٹی کاغذ میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے بیٹھ کر اپنی روٹی کو کھولا اور سالن کی بجائے ملازم کو چائے کی صرف ایک پیالی لانے کے لیے کہا۔ کسی کو اس پر تعجب نہ ہوا کیونکہ ان لوگوں میں افلاس عام ہے۔ اس جوان سے اس کی تنگدستی کی وجہ سے کسی نے تحقیر کا سلوک نہ کیا۔

اگر کسی کے ساتھ دوسرے مسافروں سے زیادہ لحاظ اور خاطر برتی گئی تو وہ لاری کا ڈرائیور تھا۔ یہ شخص' بلاشبہ' ہم سب عام مسافروں سے کہیں زیادہ معزز اور باوقار تھا اور ان عنایات اور مراعات کا ہر طرح مستحق جو ہوٹل والے اس پر نچھاور کر رہے تھے۔ اپنی بڑی بھوی مونچھوں اور تیکھے سرخ چہرے کے ساتھ وہ ایک شاندار مرد تھا...... اپنے جوتوں سمیت کوئی چھ فیٹ کا' تیر سا سیدھا' چوڑے مضبوط کندھوں کے ساتھ! البتہ اس قدرے بہتر سلوک کی اصل وجہ اس کی یہ مرعوب کن شخصیت نہ تھی۔ اس سے ایک خاص مہمان کا سا سلوک اس لیے کیا گیا کہ وہ اس ہوٹل کے لیے گاہک لاتا تھا۔ اس کی خوشامد اور رضا جوئی ان لوگوں کے لیے ضروری تھی۔ کیونکہ لاری کا ناخدا ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی لاری کو کچھ آگے اگلے ہوٹل کے سامنے بھی تو ٹھیرا سکتا تھا پھر سب مسافر اس ہوٹل میں جاتے اور ان لوگوں کا بزنس بالکل سونا ہو جاتا۔ اس ڈرائیور کو ہوٹل کے کمرے میں ایک الگ میز پر کھانا کھلایا گیا۔ کونسے خاص کھانے اس کے سامنے چنے گئے...... میں نہیں بتا سکتا۔ ہاں میں نے ایک تازہ چاندی کے نیچے کا حقہ (شاید صاحب خانہ کا اپنا!) اس بڑے آدمی کے لیے اندر جاتا دیکھا۔

کھانے کے بعد دو آدمیوں نے ہم سب کے ہاتھ چلمچی میں دھلائے۔ بڑی میٹھی چائے کے پیالے سرو کیے گئے۔ اور ہم ایک لذیذ کاہلی کے احساس سے سگرٹ پینے لگے...... اب ہوٹل کا گراموفون مہمانوں کی تفریح اور دل جوئی کے لیے بجنے لگا۔ یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ موسیقی ہاضمے میں مددگار ہوتی ہے۔ مگر یہ موسیقی سے زیادہ جھنجھناتا ہوا خوش آیند شور تھا۔ ایک ریکارڈ کا گانا مجھے یاد ہے

اس کی لے عرصے سے میری چہیتی ہے...... "ایلو...... میں ہاری پیا"...... اس جانی پہچانی پیاری لے کو اتنی دور باٹا خیل میں سننا ایک نادر مسرت تھی۔

ہمارے ساتھ ایک کھچڑی لمبی داڑھی اور کلہاڑے کے سے تیز چہرے والا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی ٹمٹماتی آنکھوں میں عمر کی شفقت اور خوش طبعی آ گئی تھی (جوانی میں وہ مختلف ہوگا) وہ ایک شگفتہ مزاج اور خوش صحبت بوڑھا تھا۔ ہم جلد ہی گفتگو میں مشغول ہو گئے وہ چٹکلوں کی پوٹ تھا اور سوات کے متعلق ہر قسم کی دلچسپ اور عجیب معلومات کا خزینہ۔ بلاشبہ اسے لوگوں میں ایک دینی عالم ہونے کی سند حاصل تھی! یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا (مگر اس کے شاداں قہقہے اور اس کے کسی قدر پھکو مزاج کی حس ثابت کرتے تھے کہ وہ نرا زاہد خشک نہیں تھا...... اپنے زمانے میں بوڑھے آدمی نے زندگی کے سب ذائقے چکھے تھے۔

اس نے ہم سے پوچھا کہ آیا ہم اس ملک میں بیوپار کے لیے جا رہے تھے اور آیا یہاں ہماری یہ پہلی آمد تھی۔ ہم نے اسے بتایا کہ

ہم بیوپاری نہ تھے اور صرف سوات دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ اس پر وہ کچھ حیران معلوم ہونے لگا اور پھر اس نے ہمیں ایسی مشفقانہ شرارت آمیز نظروں سے دیکھا کہ ہم دوست بن گئے۔

سوات بڑا اچھا ملک ہے'' بوڑھے آدمی نے کہا'' اس کی وادی بڑی زرخیز ہے اور لوگ خوشحال اور پرامن اور شگفتہ ہیں۔ اب ہر گاؤں میں ایک مڈل سکول ہے چوری اور قتل کا نام نہیں'' بادشاہ صاحب کا زمانہ نہ ہوتا تو تم اس طرح ادھر نہ آسکتا۔ راستہ میں تم قتل ہو جاتا۔ بادشاہ صاحب کے زمانے سے پہلے لوگ بڑے خراب تھے۔ قتل ایک کھیل تھا۔ کسی کا جان' مال یا عزت محفوظ نہ تھے۔ بادشاہ صاحب نے آکر یہاں انصاف اور قانون بحال کیا۔''

''بادشاہ صاحب اب بہت بوڑھا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''بوڑھا آدمی کڑکڑاتا ہوا ہنسا'' بادشاہ صاحب اب پچاسی برس کا ہے مگر بوڑھا؟ وہ تو کئی جوان سے اب بھی اچھا ہے۔ اس کی صحت رشک کے قابل ہے۔ اس عمر میں وہ ہر صبح روزانہ پانچ میل پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ بعض وقت وہ اپنے افسروں کو اپنے ساتھ ان سیروں پر لے جاتا ہے۔ جس افسر کا چڑھتے ہوئے دم پھول جائے یا جو تھک جائے اس کی شامت آجاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اس کو نوکری سے بھی برطرف کر دیتا ہے۔''

''کیا یہ بے جا سختی نہیں؟''

''نہیں۔ بادشاہ صاحب کہتا ہے کہ آرام طلب اور موٹا آدمی ماسوا اپنے دسترخوان کے بیکار ہوتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی خدمت نہیں کرسکتا نہ ہی دوسروں کے لیے مصیبت برداشت کرسکتا ہے۔ بادشاہ صاحب ایسے افسروں سے نفرت کرتا ہے۔''

ہمیں بادشاہ صاحب کی زیرکی اور اچھی سمجھ کی داد دینا پڑی۔ ایک آدمی جو اونچے پہاڑ پر چڑھنے کا دم رکھتا ہے یقیناً ایک صالح اور تندرست جسم کا مالک ہوگا۔ صالح جسم کا مطلب ہے صالح دماغ اور مطمئن ضمیر۔ پہاڑوں سے محبت کرنے والا شخص طامع اور غاصب نہیں ہوسکتا اور بوڑھے والی کا یہ اپنے افسروں کی اہلیت یا نا اہلی کے امتحان کا طریقہ بڑی عمدگی سے سارے ملک میں رائج کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے مدبروں اور سیاست دانوں اور بڑے عہدیداروں میں سے کتنے ہیں جنہیں پہاڑوں سے محبت ہے۔ ان میں سے کتنے ہیں۔ جو کبھی کسی پہاڑ پر چڑھے ہیں؟ پھر کوئی تعجب نہیں کہ ان کے جسم اور دماغ اس درجہ بیمار ہیں۔

باتا خیل کی اس مہماں سرائے میں (ہوٹل کا نام ایسی صحت بخش جگہ کے لیے نہیں جچتا) ہم ایک گھنٹے تک ستاتے رہے ...... زندہ دل بوڑھے سے خوشگوار باتیں کرتے ہوئے اور ''ایلو۔ میں ہاری پیا'' کو بار بار سنتے ہوئے۔ سرائے میں لے دے کے

چار پانچ ریکارڈ تھے۔ وہاں ہم نے کچھ عرصے کے لیے سچی طمانیت محسوس کی۔ اس نعمت کو ڈھونڈ لینا اتنا مشکل نہیں جتنا ہر کوئی سمجھتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم اسے غلط جگہوں میں تلاش کرتے ہیں...... بڑے اچھے سجے ہوئے مکانوں میں یا کسی بڑے ہوٹل کے لاؤنج میں...... سچی طمانیت مل سکتی تو ایسی سراؤں میں جیسی یہ باٹا خیل کی سرائے تھی۔ یا پھر ایک خانہ بدوش کے کلّے میں۔

اس اچھی سرائے سے جاتے ہوئے ہم نے وہاں کے لڑکوں اور خدمت گاروں میں چاندی کے سکّے تقسیم کیے...... شکرانے کے طور پر۔

قلعوں کی زمین

باٹا خیل سے چند میل آگے تنگ میٹلڈ روڈ اوپر چڑھتی ہے اور پھر ایک اور وادی میں اترتی ہے جسے ارمغان سوات کا قابل قدر مصنف اپر سوات کی وادی کا نام دیتا ہے۔ اس ہستی اور اس کتاب کے بارے میں آگے اپنی مناسب جگہ پر کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس نے اپنی کتاب "وادیاں" کے ضمن میں یہ درج کیا ہے: ریاست سوات میں دو وادیاں ہیں (۱) اپر سوات کی وادی (۲) لوئر سوات کی وادی (ممکن ہے یہ نئی وادی اپر سوات کی وادی ہی ہو۔

اس وادی میں اترتے ہوئے میٹلڈ سڑک یکلخت ختم ہو جاتی ہے اور ایک عام روڑی کوٹی ہوئی پختہ سڑک میٹلڈ روڈ سے قدرے تنگ مگر اچھی حالت میں) اس کی جگہ لے لیتی ہے...... ایک میدان جو تقریباً ہموار تھا اور جس کے حاشیوں پر بید مجنوں کے درخت تھے۔ ہمارے بائیں کو وادی ایک فراخ گاڑھا سبز بہشت تھی اور درخشاں دھند پرے پہاڑوں کے فاصلے کو طویل کرتی تھی۔ صنوبر، دیودار اور چنار کے اکا دکا یا ننھے جھنڈ میں بہار کے اجلے اجلے پیراہن اوڑھے وادی میں اور پہاڑ کی ڈھلانوں پر نمودار ہونے لگے تھے اور بے مثال بکائن کے اودے پھول آنکھوں کے لیے ایک نادر مسرت تھے۔ اپی کیورس چیڑھ دیکھنے کا بے حد مشتاق تھا۔

چیڑھ پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلند پر اگتا ہے...... پھر اپی کیورس نے اپنا چیڑھ دیکھ لیا۔ اکیلے تجمّل میں یہ ایک اونچی پہاڑے کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ اپی کیورس نے بڑی خوشی اور فخر سے اس کی طرف اشارہ کیا...... دریائے سوات اپنے جنگلی پھولوں اور زمردیں دوب کے بستر میں ایک بلوریں فیتہ تھا۔

تقریباً یہیں ہم نے دور شمال کے پہاڑوں پر برف چمکتی دیکھی۔ بوڑھے سرفراز گل نے ہمیں بتایا کہ یہ پہاڑ گناہگار کہلاتا ہے ...... بے شک ایک پہاڑ کے لیے یہ ایک عجیب نام ہے مگر اس کے پیچھے ایک روایت ضرور ہوگی۔ اس انکشاف نے اپی کیورس کو قدرے مایوس کر دیا۔ اس نے ایک بے لگام رومینٹک تخیل سے کام لے کر امید ظاہر کی تھی کہ یہ نانگا پربت کی برف ہے...... وہ

قاتل پہاڑ جس پر جرمن بوہل چڑھا تھا اور جہاں عجیب عجیب آوازوں نے اسے اندھیرے میں پکارا تھا اور جس پر سے وہ گرتا پڑتا اور نیم پاگل اپنے دوستوں کے پاس لوٹا تھا...... بعض لوگوں پر چاند کا سایہ پڑ جاتا ہے اپنی کیورس کے لیے برف بھی کچھ اسی قسم کا اثر کرتی ہے۔ وہ اتنا مضطرب تھا اور اتنی دفعہ برف پوش پہاڑیوں کی طرف وجد کی حالت میں اشارے کرتا تھا کہ بوڑھے آدمی نے بیچ بیچ اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ باؤلا ہو۔

بوڑھا سرفراز گل ہم سے پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا چٹکلے بیان کرتا تھا اور مذاق کرتا تھا۔ اس کی زبان بھی نہیں رکتی تھی۔ کوئی انوکھی اور نئی چیز آتی تھی۔ تو وہ ہمیں اس کے متعلق بتاتا۔ وادی کا آدمی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے چپے چپے کو جانتا تھا اور چونکہ وہ ایک دنیا دار عالم بھی تھا اس لیے ٹوٹی پھوٹی اردو میں وہ احساسات دوسروں تک منتقل کر سکتا تھا۔

بعض وقت دریا پلٹتا اور امڈتا سڑک کی بغل میں آ جاتا۔ کیسا عجیب دریا' بلور بھی اس سے زیادہ صاف اور شفاف نہ تھا۔ ایک ایسی جگہ میں نے ایک خوبصورت پہاڑی عورت کو مشکیزوں کی بنی ہوئی ڈونگی میں کھڑے دیکھا۔ سورج کا سونا اس کے بالوں اور آنکھوں میں تھا اور ایک لمبے بانس سے ڈونگی کو پیرا کر دریا کے دوسرے کنارے پر جا رہی تھی۔ یہ تصویر میرے ذہن میں محفوظ ہے اور لاتعداد دوسری تصویریں خانہ بدوشوں کے قافلے اپنے گدھوں اور خچروں پر گذرتے ہوئے...... ایک گاؤں میں چند بچے ایک آڑے تختے کے سروں پر بیٹھ کر جھولتے ہوئے...... وہ دنیا کی ہر جگہ کے بچوں کی طرح تھے۔ غور کرنے والے دماغ کے یے ایک ملک کے انسانوں اور دوسرے ملکوں کے انسانوں کی بنیادی خواہشات اور امنگوں میں چنداں فرق نہیں۔ تبت کے ایک بچے کو مہذب ترین ملک میں لے جاؤ تو وہ مشکل ہی سے وہاں اجنبیت محسوس کرے گا۔ وہ وہاں کے بچوں سے اس طرح گھل مل جائے گا جیسے وہ اس کے اپنے گاؤں کے دوست ہوں۔ انسان جب بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر نہ جانے انہیں کیا ہو جاتا ہے؟

ہم ایک چٹان پر تختوں میں بنے ہوئے پتھریلے قصبے کے بیچوں بیچ گذرے۔ حاجی سرفراز گل نے سوٹ اور سواتی ٹوپی میں ایک لمبے گٹھے جسم کے شخص کی طرف ہمیں متوجہ کیا۔ وہ اپنے معمولی مکان کے چھوٹے پھاٹک کے باہر گلی میں کھڑا تھا" یہ" اس نے بتایا "والی کے ضلع کے حاکموں میں سے ہے"...... ایک عہدیدار جو ہمارے ہاں کے ڈپٹی کمشنر کے برابر تھا۔ سرفراز گل کو یا تو پتہ نہ تھا یا حب الوطنی کی وجہ سے وہ بتانا نہ چاہتا تھا مگر جب ہم نے اس سے ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنے چوڑے کندھے ہلا دیئے۔

اس سارے عرصے میں ہم شمالی یا شمال مشرقی سمت میں سفر کرتے رہے۔ اب ہم نے ایک چکر کاٹا اور ایک اور وادی میں داخل

ہوئے۔ چٹان اب ہمارے بائیں کو تھی' وادی دائیں کو اور ہم جانے بغیر ۱۸۰ درجے کے زاویے میں سے گھوم گئے تھے (ایک تجربہ جو پہاڑی سفر میں کافی عام ہے) اور سیدھے جنوب کو جا رہے تھے ...... دریا اب ایک بل کھاتے ہوئے بیمیں اژدہے کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ لہراتا جاتا تھا...... کبھی پلٹ کر آتا ہوا کبھی ہٹ کر بہتا ہوا اور کبھی مست خرام اور کبھی اس کے ایک بازو کا پانی دوسرے میں دھارے بناتا ہوا۔ بہتا تھا۔ یہ ایک شاداں وادی میں شاداں دریا تھا۔

پھر ہم رک گئے۔ سامنے ایک پھاٹک تھا۔ ہم سواتی محصول کی چوکی پر تھے۔ ہم نے اتر کر ایک چھوٹی چائے کی دوکان میں چائے پی۔ اور سنہری سہ پہر میں وادی کے جادو کا نظارہ کیا۔ ہم تعجب کرتے رہے کہ کوئی دوسری جگہ بھی اتنی خوبصورت ہوسکتی ہے۔ چوکی کے محصول کے لیے ہماری لاری کی چھت پر چڑھ کر اسباب کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ بیشتر مسافروں کو اپنے ٹرنک یا بستر کھول کر معائنہ کرانا پڑا مگر انہوں نے ہم سے کچھ پوچھ گچھ نہ کی...... سامنے پھاٹک کے پاس تین سائن بورڈ تھے...... سیدو کے ہوٹلوں کے اشتہار...... ایک بس سوات کی سمت سے آئی اور پھاٹک کی پرلی طرف رک گئی۔ اس کے مسافر باہر نکلے۔ ان میں ایک اٹھارہ سالہ امریکن لڑکا تھا۔ چکنے خاکی میں ایک قدرے پلپلا پھولا ہوا لڑکا...... تیز بین شیشوں کی عینک لگائے اور کندھوں سے ایک کیمرہ لٹکائے...... اس کے ساتھ اس کا ایک پاکستانی ہم عمر دوست تھا اپنے انداز میں کسی قدر نخریلا۔ وہ چائے کی دوکان پر آئے۔ امریکن لڑکا پاس پڑی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اس کا دوست کہیں سے بوڑھے سرفراز گل کو پکڑ کر لے آیا۔ بوڑھا لڑکے کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھ گیا اور وہ آپس میں فارسی میں باتیں کرنے لگے۔

بعد میں جب ہم اپنی لاری میں سوار ہوئے تو سرفراز گل نے ہمیں بتایا کہ لڑکا امریکی تھا اور اکیلا بخارا سے آ رہا تھا۔ وہ فارسی مادری زبان کی طرح بولتا تھا۔

یہ امریکن لڑکا کون تھا؟ ہم نے تعجب کیا! وہ بخارا سے کیوں آ رہا تھا؟ وہ بخارا کیوں گیا تھا؟ کیا وہ امریکی جاسوس تھا؟ یا کیا رومانس اور سفر کی تلاش میں ہم سا آوارہ گرد؟ جو کوئی بھی ہو وہ تھا بہر حال ایک لڑکا جو بخارا سے آ رہا ہو۔ اس سے زیادہ قابل رشک اور کون ہوسکتا ہے؟ وہ اپنے کئی ہم عمروں سے کتنا خوش قسمت تھا جو کلاس روموں میں خشک لکچر سن رہے ہوں گے یا کسی فیکٹری میں کوئی پرزہ ڈھالنے میں لگے ہوں گے۔

چونگی سے گزر کر سڑک پر وادی کے گرد وسیع دراتی کے سے نیم دائرے میں گھومی اور جب ہم نیم دائرے کے دوسرے سرے پر پہنچے تو وادی ہمارے بائیں کو تھی اور ہم شمالی سمت کو جا رہے تھے۔ سب مسافروں کے لیے شمالی سمت اصل سمت ہے۔ دوسری سمتیں

مسافروں کے لیے نہیں بلکہ وکیلوں بیوپاریوں اور کارخانوں کے مالکوں کے لیے ہیں۔ (میں جانتا ہوں یہ محض بکواس ہے۔ تاہم اس میں کافی صداقت کی رمق ہے)

ہم ایک گاؤں کے پاس سے گزرے۔ یہاں ایک سبزہ زار میں ایک چھوٹا سا قلعہ ایستادہ تھا۔ یہ ایک دوستانہ چھوٹا قلعہ تھا ...... شکل میں ایک مکعب...... اس کی دندانے دار فصیل کے چاروں کونوں پر برج تھے۔ برج شطرنج کے رخ تھے۔

''لکڑی کی کھپچیاں تھموں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں اور یہ سب کچھ ستھری بیدکاری کا تاثر دیتا تھا...... سرفراز گل نے بتایا کہ یہ ''تھانہ'' ہے۔ اب ایک تھانے سے اس کا مطلب پولیس اسٹیشن سے تھا یا فوجی چوکی سے یا محض غلہ جمع کرنے کی جگہ سے ...... ہمیں معلوم نہ ہوگا...... ہر ننھے گاؤں میں یہ برج نما قلعہ موجود تھا۔ یہ ہمیں پتہ لگا ایک طرح سے سوات کا قومی نشان ہے جس طرح شیر ببر اہل انگلستان کا اور جھپٹتا ہوا عقاب المانیہ کا۔

سڑک کے ساتھ ساتھ صنوبروں اور لمبے سردوں کی چاردیواری میں محفوظ لوکاٹ اور اخروٹ اور سیب کے باغات تھے...... اور دور دور تک پوست کے نرم سپید پھول ہوا میں ناچتے تھے۔ میں نے سرفراز گل سے پوچھا ''تمہارے ملک میں لوگ پوست تو بہت پیتے ہوں گے؟''

اس کی آنکھیں ٹمٹمائیں ''یہ خدا کا تحفہ ہے۔ لوگ پیتے نہیں۔ بس کاشت کرتے ہیں۔''

یہ کیسے ہوسکتا ہے' میں نے سوچا پوست کے ذائقے اور نشے سے محروم رہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے انگوروں کے ملک میں لوگ انگوروں کی شراب کشید نہ کریں۔ آدمی کی زندگی میں ایسی منزلیں آتی ہیں جب نشیلی چیزوں کو مطعون کرتے ہیں کہ یہ صحت اور روپے کو برباد کرتی ہیں اور مذہب اور اخلاق کے خلاف ہیں...... درست...... مگر یہ آدمی کو وقتی طور پر دیوتاؤں کے ساتھ اولمپیا پر بھی بٹھا دیتی ہیں...... اسے لافانی خواب دیکھنے کی قوت عطا کرتی ہیں اور خدائی کا ایک لمحہ پچھتر سال کی باعزت' بے حصول خودغرضانہ زندگی سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے...... اور کہیں زیادہ طویل۔

حاجی سرفراز گل سیدو سے ایک دو میل ادھر ایک مسافر خانے کے سامنے اترا ''میں یہاں اتر جاؤں گا'' اس نے کہا ''میرا دل تو چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ چل کر تمہیں سیدو کی سیر کراتا لیکن میرا کام ضروری ہے۔''

ہمیں اس کے جانے کا افسوس ہوا' وہ ایک بے مثال بوڑھا آدمی تھا...... ان خوش باش بوڑھوں میں سے ایک جو زندگی کی شام میں ڈھارن سے نیچے اترتے ہوئے اپنے دل کی استقامت نہیں کھوتے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے۔ وہ زیادہ رسیلے اور روادار ہوجاتے

ہیں۔

شہر طلسمات

نیلی آنکھوں والے ایک خوش شکل خوش اعضاء نوجوان نے جس کے سرخ تیکھے چہرے میں دن کی تاب اور پہاڑوں کی شادمانی تھی میرے کندھے پر ہاتھ رکھا' ایسا نوجوان تم میدانوں میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔

''یہ'' اس نے کہا ''سیدو شریف ہے...... والی صاحب ادھر رہتا ہے۔'' اور اس نے بائیں طرف پہاڑی پر بنے ہوئے ایک شہر کی طرف اشارہ کیا۔

ڈھلتی ہوئی سہ پہر میں سیدو واقعی فنتاسٹک لگتا تھا...... اور جدید...... ایک کوہستانی قصبہ نہیں جیسا کہ ہم امید کر رہے تھے۔ رنگین روشنی میں بنگلے اور حویلیاں اور اونچی پہاڑی کے گرد اکٹھی ہو رہی تھیں۔ ایک نیلی دھندی شہر کے اوپر معلق تھی اور سیدو کہانیوں کی کتاب کا شہر لگتا تھا۔

یکلخت سڑک مٹیلڈ ہو گئی اور چوڑی بھی۔ بجلی کے پول سڑک پر نمودار ہونے لگے۔ ہم ایک چوڑے گلابی پلیش کی دوکانوں کے بازار میں سے گزر رہے تھے۔ چوک پر ملیشیا میں ایک پولیس میں بجلی کے پول کے اوپر تنی ہوئی چھتری کے نیچے کھڑا تھا۔ مستعدی سے اس نے ہمیں ہاتھ دیا۔ ہم آگے گزر گئے اور لاری کے اڈے پر جا رکے۔

خوش شکل پٹھان نے کہا ''یہ منگورا ہے۔ نہیں بس سیدو نہیں جاتی۔ تم سیدو سیر کے لیے جا سکتا ہے' وہاں تانگہ جاتا ہے۔ تم ٹھہرے گا منگورا ہی میں سیدو میں ہوٹل نہیں ہے۔''

ہمارے اترتے ہی گویا منگورا کے سارے فقیر چھوکروں نے ہم اور ہمارے سامان پر ہلہ بول دیا۔ وہی جوہر آباد کا قصہ پھر دہرایا گیا۔ اور اس سے پیشتر کہ ہم جانتے کہ ہم کہاں تھے' اپی کیورس اور میں کوئی بیس مزدور لونڈوں کی ہمراہی میں سڑک کے نیچے مارچ کر رہے تھے...... اور سارے بازار کے لیے ہنسی کا نشانہ...... میں نے اپی کیورس کو اتنے مزدوروں کو اجرت دینے کی حقیقت سے بیکار آگاہ کیا۔ میں نے اسے ان لونڈوں پر نگاہ رکھنے کے لیے بیکار بار بار کہا۔ وہ ہمارے سامان کے ساتھ غائب ہونے کے اہل تھے۔ اپی کیورس محض مسکرایا۔ وہ فقیر چھوکروں سے محبت کرنے کے موڈ میں تھا۔

ان بچوں کا سرغنہ ایک چالاک چھٹا ہوا لڑکا تھا۔ وہ ہمیں گلی کے آخر میں ایک محراب دار پھاٹک کے ہوٹل میں لے گیا۔ یہ جگہ ہوٹل سے زیادہ ایک بھٹیار خانہ تھی مگر چالاک لڑکے نے مجھے یقین دلایا کہ اس سے بہتر رہائش اور کھانا ہمیں منگورا میں اور کہیں نہیں

ملے گا۔ اپی کیورس سامنے کے ہوٹل کو دیکھنے چلا گیا تھا جو دو منزلہ تھا اور ایک چھوٹی سڑک کے اوپر دیکھنے والی بالکنی رکھتا تھا۔ موٹے چالاک لڑکے نے میرے احتجاجوں کے باوجود ہمارا سامان اس بھٹیار خانے کے ایک کمرے میں اتروا دیا۔ یہ کمرہ بڑا اور نہایت غلیظ تھا۔

''ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔'' میں نے مزدور لڑکوں کو حکم دیا کہ سامان اٹھا کر سامنے کے ہوٹل میں لے چلیں۔ سامنے کے ہوٹل کا نام نشاط ہوٹل تھا۔

چالاک لڑکے نے شور مچانا شروع کر دیا ''وہ نشاط ہوٹل والا چور ہے اور پانچ روپیہ روز کرایہ لیتا ہے۔ ادھر کل ڈیڑھ روپیہ۔ دیکھو اچھا کمرہ ہے۔''

''ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔'' میں نے غصے میں کہا اور سامان اٹھوا کر باہر سڑک پر نکل آیا۔ اپی کیورس نشاط ہوٹل کی بالکنی میں ایک شریر مطمئن گوریلے کی طرح کھڑا مجھے اوپر بلا رہا تھا۔ مایوس اور گستاخ لڑکا اپنے ہوٹل کے باہر آ کر چلا رہا تھا ''بابو! وہ ہوٹل گندہ ہے۔ وہ چور ہے۔''

میں ہوٹل میں داخل ہوا۔ ڈائننگ روم صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ اس میں پتھر کی میزیں تھیں۔ کاؤنٹر پر ایک چھوٹا سا شخص کھڑا تھا...... اتنا معصوم کہ وہ مجھے ایک نورانی فرشتہ معلوم ہوا۔ اس نے دلآویز مسکراہٹ سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پشتو میں میری خیریت پوچھی اور مجھے سیڑھیوں کی راہ دکھائی۔

بالکنی کے کمرے میں سامان رکھوانے کے بعد میں بالکنی میں آیا تو وہی موٹا چھوکرا چلانے لگا ادھر بابو دال بھات ملے گا ادھر بھنا ہوا گوشت ہے۔''

میں نے چاہا کہ نیچے جا کر اس کی ٹھکائی کروں۔ مگر میں بزدل آدمی ہوں۔ آخر اپی کیورس اور میں نے کمرے کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

مجھ میں (اس کا اقرار کرنے کی غالباً ضرورت نہیں) ذرہ برابر بھی خودداعائی کا مادہ نہیں۔ اپی کیورس میں خوش قسمتی سے یہ شے بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہمارے ورود نے نشاط ہوٹ کے عملے کو (وہ دو چپٹی ناکوں والے مشٹنڈے لڑکے تھے۔ پیر گل اور گل نواز نامی) بھگا نا دوڑانا شروع کر دیا۔ ایسے معزز اور اہم مہمانوں نے ایسا لگتا تھا۔ نشاط ہوٹل کو کبھی پہلے عزت نہ بخشی تھی انہوں نے بلاشبہ ہوٹل کا سب سے اچھا کمرہ ہمیں دیا تھا۔ (صرف اسی کمرے کے آگے بالکنی تھی) ہم نے بستر کھولے سامان ٹھیک ٹھاک کیا۔ نہا دھو کر تازہ دم

ہوئے۔ ہم نے اجلے کپڑے پہنے اور نئے آدمیوں کی طرح محسوس کیا۔ چائے پینے کے بعد جب ہم سیدو کا چکر لگانے کے لیے نیچے آئے تو گہری نیلی شام پڑ چکی تھی اور بجلی کے لیمپ روشن تھے۔ ہم سیدو شریف جانے والی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کسی بڑے جدید شہر کی سڑک سے کسی طرح کم نہ تھی...... بڑی چوڑی اور پوری طرح میٹل کی ہوئی اس کے دورویہ بید مجنوں اور صنوبر ایستادہ تھے اور جنگلی پھولوں کی خوشبو ہوا میں رچی ہوئی۔ آسمان تاریک مخمل تھا اور نتھرے ہوئے چمکدار تارے جھرمٹوں میں اوپر سیدو پر گر رہے تھے ...... سیدو کی سب پبلک اور سٹیٹ عمارتیں اسی سڑک پر تھیں۔ شہد کی مکھیوں کا ایک فارم تھا۔ اس سے آگے بائیں کو اسٹیٹ کالج کی عمارت تھی...... حرف ب کی شکل کی جس کے سامنے کے کونوں پر سانپ کی چھتری کے پودے کی شکل کے دو برج تھے۔ وہ اس جھٹپٹے میں ایک عجیب پر اسرار تاثر دیتے تھے۔ سڑک آگے بتدریج چڑھتی گئی۔ سٹیٹ ہسپتال اور سوات ہوٹل کی عمارتیں آئیں۔ اندھیرے میں ہم عمارتوں کو اچھی طرح ابھار نہ پاتے اور کھڑے ہو کر ان کے نام کے بورڈوں کو پڑھنے کی کوشش کرتے۔ ہم اسی طرح چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے سڑک دو شاخوں میں بٹ جاتی تھی۔ بجلی کے پول کے نیچے اس نقطے پر ایک راہ نما تھا ...... زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دو بازوؤں کے ساتھ ایک بازو پر لکھا تھا ''ولیعہد صاحب'' دوسرے پر ''والی صاحب'' اس سے ہم خوب محظوظ ہوئے۔ جگہوں اور سڑکوں کے نام دینے کی بجائے فنگر پوسٹ پر ان ہستیوں کے نام دینا جو غالباً ان سمتوں میں رہتی تھیں ایک عجیب اور غیر معمولی اختراع تھی...... والی صاحب اور ولی عہد صاحب دونوں معزز ہستیاں شہر کے دو متقابل سروں پر فروکش تھیں۔

''اب فیصلہ کرو'' میں نے اپنی کیورس سے پوچھا ''ولی عہد صاحب یا والی صاحب'' ''ولیعہد صاحب'' اپنی کیورس نے جھٹ جواب دیا۔ جیسا کہ اس کے بارے میں کوئی شک نہ ہو سکتا تھا۔

اور ہم ولیعہد صاحب کی سڑک پر ہو لیے۔ مخملی اندھیرے میں یہ جادو کی سڑک تھی اور یہ (کسی طرح) ہمیں سیدو شریف کی خوش کن پیچدار گلیوں میں لے گئی۔ شہر الجیرز کے ''قصبہ'' کی طرح گلیوں اور کوچوں کا جنتر منتر ہے...... گلیاں جو نیچے اترتی ہوئی سیڑھیاں ہیں اور زمین کی انتڑیوں میں جاتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور پھر اچانک پر اسرار تالابوں کے پاس آنکلتی ہیں...... سیدو شریف کا مزار ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ سب کوچے آخر کار ہمیں مزار پر پہنچتے ہیں۔ تم کوئی بھی گلی پکڑو۔ ہر پھر کر تم مزار پر پہنچو گے۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے اور دیکھنے کے قابل۔ اس کا ایک عیب یہ ہے کہ یہ فقیر چھوکروں سے پٹی ہوئی ہے...... اپنی کیورس اور میں جوتیاں ہاتھ میں پکڑے اس کے ٹھنڈے صحنوں میں گھومتے رہے۔ فقیر بچوں کی فوج ہمارے جلو میں تھی۔ ہم ایک جھروکے دار اونچے ایوان میں

گئے۔ جہاں مزار ایک قیمتی غلاف میں منڈھا ہوا تھا۔ ایک سیاہ چوکھی داڑھی والا آدمی دوزانو بیٹھا گڑگڑاتے لہجے میں پیر سے کوئی منت مانگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری تھی کسی قدر لومڑ کی جھلک اور اس کا چہرہ ایک ایماندار چہرہ نہ تھا...... تم ان لوگوں کو جانتے ہو گے جن کے دل مذہب کی سچی روح سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ جو اپنے ہمسائے کی کھال ادھیڑنے سے نہیں چوکیں گے۔ اگر اس سے ان کا کچھ فائدہ ہوتا ہو۔ ایسے لوگ اکثر پیروں سے فیض حاصل کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ فیض سے ان کی مراد دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور اگر انہیں ایک پیر کے دربار سے فیض نہیں ملتا تو وہ دوسرے پیر کے دربار پر جائیں گے اور فیض پانے کے لیے کڑی شب بیداریاں اور چلہ کشیاں کریں گے۔ مزار کے پاس ہی ایک وسیع ایوان میں مسجد ہے۔ بڑے فانوس چھت سے لٹک رہے تھے۔ مزار سے باہر ہم نے حاتم طائی بن کر جودوسخا کے دریا بہائے۔ میں نے ایک دوکان سے کیپسٹن کا پیکٹ خرید کر دس کے نوٹ کو چھوٹی ریزگاری میں تبدیل کر لیا تھا اور اب ہم نے اسے فقیر بچوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ہم سیدو میں تھے اور اس مبارک سانحہ کی خوشیاں منانا چاہتے تھے۔ مگر یہ ہماری غلطی تھی۔ جلد ہی سیدو کے سارے گداگر بچے اور اپاہج ہمارے گرد جمع تھے۔ اتنی سی ریزگاری ان کے لیے کافی نہ ہو سکتی تھی۔ سو ہم وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے......

معطر اور مخملی رات میں ہم واپس ہوٹل میں آئے۔ پیر گل نے ہمیں کھانا کھلایا۔ تھکے ہارے تو ہم تھے آتے ہی مثالی گھوڑے بیچ کر سوئے...... اچھے اچھے خواب اپنے سروں میں لیے ہوئے۔ ٹھنڈی ہوا بالکنی میں سے اندر آ رہی تھی اور تارے باہر کالی رات میں منگورا اور سیدو پر دمک رہے تھے۔

خوارزخیل

دوسرے دن (نو اپریل) چائے اور تلے ہوئے انڈوں کا ناشتہ کر چکنے کے بعد ہم نے پیر گل کی آرزو پوری کی۔ جواب دینے سے پہلے اس نے سوچا۔ پر اس نے کہا۔ نورین سے ایک لاری دس بجے جاتا ہے۔ دوسرا چار بجے شام۔ دس بجے کا لاری پھر شام کو منگورا سے واپس آ جاتا ہے۔

پیر گل "سے" اور "کو" کے فرق کے بارے میں پوری طرح واضح نہ تھا۔ وہ فقرے میں ایسی جگہ "سے" استعمال کرتا جہاں "کو" زیادہ موزوں ہوتا۔ اس عادت سے اس کے فقرے اکثر اس کے مطلب سے بالکل الٹ مفہوم دینے لگتے اور سننے والے کے لیے ایک پر لطف الجھن کا سبب ہوتے۔ یہ جاننے میں ہمیں کچھ وقت لگا کہ نورین سے ایک لاری' سے اس کا مدعا نورین کو جانے والی لاری سے تھا...... وہ بعض دفعہ "سے" کو ویسے ہی فقرے میں لے آتا جہاں قطعاً غیر ضروری ہوتا۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ آیا مدین منگورا سے اچھی جگہ ہے؟...... ہمارا مطلب تھا۔قدرتی خوبصورتیوں کے معاملے میں۔اس نے اس پر سنجیدگی سے غور کیا اور اپنے دل میں جواب مکمل کر کے کہا ''مدین سے منگورا کا بازار اچھا نہیں ہے۔''

بے چارہ چھوکرا! وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ مدین کا بازار منگورا کے بازار سے اچھا نہیں ہے۔مگر ''سے'' کے بے جا استعمال نے اس کے فقرے کو بالکل مختلف معنی دے دیئے اور اس کے جواب کو معما بنا دیا۔

''تمہارا مطلب ہے مدین کا بازار اچھا ہے؟'' اس نے وضاحت سے کہا۔

مگر یہ وہ نہ تھا جو ہم جاننا چاہتے تھے یعنی یہ کہ مدین کے پہاڑی نظارے منگورا سے پر شوکت ہیں یا نہیں۔ان باتوں کے متعلق لڑکا بھلا کیا سمجھ سکتا' اس نے کبھی ان جگہوں کے اس پہلو کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ایک جگہ اچھی تھی اگر اس کا بازار اچھا تھا۔اتنی اچھی نہیں' اگر اس کا بازار چھوٹا تھا۔قدرت کی رنگینیوں کو اس میں دخل نہ تھا۔آدمی سوچتا تھا کہ کیا کبھی اس لڑکے کا دل ایک جنگلی گلاب کو دیکھ کر اچھلا ہے؟ شاید نہیں۔وہ ہمیں پتہ لگا مدین کے پاس کے ایک چھوٹے گاؤں کا رہنے والا تھا۔اس کا باپ مر چکا تھا اور لڑکا اپنی چھوٹی عمر میں ہی پہاڑ کی بے فکر آزادی کو چھوڑ کر ایک سخت دنیا میں روزی کمانے پر مجبور ہو گیا تھا۔یہ جان اور روح کو اکٹھا رکھنے کی مستقل تگ و دو ایک لڑکے کو جھرنوں اور سبز پوش پہاڑیوں کی خوبصورتی پر غور کرنے کا وقت نہیں دیتی۔تاہم بیر گل کی بدقسمتی پر رحم کرنا اور اس بات کا ماتم کرنا کہ وہ کبھی غالب کی شاعری کے حسن سے متاثر نہ ہو سکے گا' یا یہ کہ شیوبرٹ کے نغمے اس کی روح کو کبھی نہیں ہلائیں گے بالکل فضول اور احمقانہ بات ہے۔ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو ایک سادہ' معصوم دل اور مضبوط صحت کی ضرورت ہے۔تم غالب کا ایک لفظ جانے یا شیوبرٹ کے نغموں کو سمجھے بغیر بھی خوبصورت زندگی گزار سکتے ہو اور ایک ریوڑ کا چرواہا ہونا' ایک روکھے چڑچڑے فلسفی ہونے سے کہیں بڑی خوش بختی ہے۔غالب کی شاعری اور شیوبرٹ کے نغمے ہی دنیا کا سارا حسن نہیں ہیں اور اس کو سمجھنے کا اہل ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ تمہارا دل لطیف ہے یا تمہارا ضمیر صاف۔ایک چرواہا اپنی بکریوں اور ریوڑ کے ساتھ اپنی پہاڑی ڈھلان پر گھنٹوں قدرت کے اسرار پر غور کرتا ہے۔وہ گنگناتے ہوئے چشموں کے راگ سنتا ہے اور موسم کے بدلتے ہوئے چہرے اور موجیں دیکھتا ہے وہ میز پر جھکے ہوئے تمہارے شاعر یا افسانہ نگار کے مقابلے میں چیزوں کے اصل جوہر سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔وہ چرواہا ان چیزوں کو نثر یا شعر میں بیان نہیں کر سکتا مگر تم اس کے لیے اس پر رحم کیوں کھاؤ ''ان کہے نغمے کہے ہوئے نغموں سے کہیں میٹھے اور رسیلے ہوتے ہیں' ایک پہاڑی آدمی ایک نظارے کو دیکھ کر تم سے یہ نہیں کہے گا '' یہ نیلی پہاڑی کتنی خوبصورت ہے۔'' لیکن تم پہاڑی لوگوں کی آزادی اور شادمانی کو ان کی آنکھوں' ان کے سارے وجود میں دیکھو گے ...... اس سے

مجھے خیال آتا ہے کہ ہم قدرتی نظاروں کا ذکر ضرورت سے زیادہ شعر اور نثر میں کرنے کے عادی ہیں۔ آرٹ زندگی کی ایک نامکمل مصنوعی تقلید ہے اور آرٹ کے حسن سے لطف اندوزی کی اہلیت بہت سے لوگوں میں پینگن کی ترکاری کی طرح ایک اکتسابی ذوق ہے۔

کندھوں سے رائفلیں لٹکائے اور بے پروائی سے ہنستے ہوئے...... اپی کیورس سوات پر کوئی گائیڈ یا معلوماتی کتاب حاصل کرنے کا مشتاق تھا۔ ہم اسٹیشنری اور کتابوں کی ایک دوکان پر چڑھ گئے۔ پروپرائٹر کاؤنٹر کے پیچھے سے تعظیماً کھڑا ہو گیا...... نہ ہی اس کے پاس سوات کا کوئی گائیڈ میپ تھا نہ کوئی کتاب۔ پھر اس نے ہمیں تھوڑی دیر کے لیے ٹھیرنے کو کہا۔ اپنے ایک جواں اسسٹنٹ کو پاس کی کتابوں کی ایک اور دوکان میں بھیجا۔ وہ گویا وہی کتاب لے کر آیا جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ اس کا ٹائٹل ''ارمغان سوات'' تھا اور یہ شیخ مظفر حسین سی پی ایس کی تصنیف تھی۔ اس میں چند فوٹو گراف بھی تھے ہم نے اسے خرید لیا۔ یہ ہمارا شیخ مظفر حسین کی مشہور ہستی سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ اب وہ نادر آب تاب سے ایک واحد روشن سیارے کی طرح سوات کے ادبی اور علمی آکاش میں چمکنے لگا۔ ہم شیخ مظفر حسین سے ملنا چاہتے تھے۔ ہم اسے کہاں مل سکتے ہیں؟ سی پی ایس وہ کیسے تھا۔

مگر کتاب کو حاصل کرکے ہم وہاں سے بھاگے۔ وقت اب نو کا تھا۔ لاری دس بجے جاتی تھی۔ لیکن اپی کیورس کی رائے تھی کہ ہمیں نشستوں کے متعلق مطمئن ہونے کی خاطر وقت سے آدھ گھنٹے پہلے پہنچنا چاہیے۔ راستے میں ہم تین چار دوا فروشوں کی دوکانوں پر ''وکس'' کا پتہ کرنے کے لیے رکے۔ یہ دوکانیں انگریزی دواؤں سے بھری ہوئی تھیں بے شمار پیٹنٹ دواؤں کے ڈبے خوش اسلوبی سے الماریوں میں سجے تھے ''وکس'' کے کئی پیکٹ ان میں مجھے نظر آئے لیکن دوکانداروں نے ہمیں یقین دلایا کہ مدت سے مال نہیں آیا۔ یہ سب ڈبے خالی تھے اور محض دوکان کی شو کی خاطر رکھے گئے تھے اس کے بعد دل میں منگورا کے طلسماتی شہر ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ رہا۔

بس تقریباً بھر چکی تھی جب ہم وہاں پہنچے۔ اپی کیورس نے میری ''وکس'' کی تلاش کو اس تاخیر کا موجب گردانا۔ یہ اس کی قطعاً زیادتی تھی۔ ایک آدمی کرسی میز لگائے ٹکٹ بیچ رہا تھا۔ اپی کیورس کو دیکھ کر وہ تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ اپی کیورس ویسے بھی بارعب آدمی ہے اور اپنے فیلٹ ہیٹ اور چشموں میں تو وہ بہت ہی بارعب تھا۔ اس اچھے نے کسی نہ کسی طرح ہمارے لیے دو نشستیں پیدا کر ہی لیں۔ ایک ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر دوسرے اس سے پیچھے۔ فرنٹ سیٹ پر ایک اور آدمی سوٹی ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا...... شلوار

قمیض میں اور کچھ کچھ ایک احمق سکول ماسٹر کا سا...... ہم اسے جانتے تھے۔ یہ مردان سے ہمارے ساتھ ہی سوار ہوا تھا اور ہم نے اسے نشاط ہوٹل میں دیکھا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ واقفیت گانٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اپی کیورس کو وہ اپنی ''خودا ہم'' چھچھوری وضع کے سبب پسند نہ آیا تھا۔ اور ہم اس سے زہر کی طرح بچتے رہے تھے...... اپی کیورس نے اس کے ساتھ بیٹھنے پر پیچھے بیٹھنے کو ترجیح دی اور مجھے اس بور اور خالی دماغ شخص کے سامنے بیٹھنا پڑا۔ وہ اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور سوٹی پر ٹیک لگا کر زیادہ سے زیادہ جگہ سمیٹے ہوئے تھا۔ میرے اس آنے کو اس نے پسند نہ کیا اور وہ اپنی سمیٹی ہوئی جگہ سے ذرہ بھر بھی نہ سرکا' میں دبک کر ایک غیر آرام دہ طریق سے بیٹھ گیا۔ میں اپنے پاؤں بھی نہیں پھیلا سکتا تھا۔ کیونکہ نیچے گیر باکس کے پاس اس بے تمیز شخص نے اپنی گٹھڑی اور چمڑے کا اٹیچی رکھا ہوا تھا۔ اپی کیورس بھی پیچھے دو نسوار کھانے اور تھوکنے والے سواتی بزرگوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا...... کچھ آگے جھکا ہوا۔

ڈرائیور جب وہ دس بجے اپنے سٹیرنگ پر آ کر بیٹھا تو ہالی وڈ کے سٹیورٹ گرینجر کا ہم صورت نکلا...... وہی تیکھا لمبا چہرہ' تیلے حساس چھوٹا ڈھیلا منہ' وہ پتلا اور خوبصورت تھا۔ لیکن کسی طرح تم اسے پسند نہیں کرتے تھے...... جہاں تک میرا تعلق ہے میں دنیا کے اسٹیورٹ گرینجروں سے نفرت کرتا ہوں۔ بعض عورتوں کے لیے شاید ان میں کشش ہوتی ہوگی۔ مگر میرا خیال ہے کہ کوئی آدمی اتنی جنسیت سے بھری ہوئی ہستیوں کو حقیقی طور پر دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔ تم انسانی گرمی کو ان کے سرد گدھے کے سے چہرے پر تمتماتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ اگر تم عورت ہو تو وہ تمہیں سیدھے بستر میں لے جانا چاہیں گے۔

منگورا کے نواح سے نکل کر سڑک مڑتی اور چکر کاٹتی' تدریجی چڑھائی چڑھتی ہے۔ یہاں شروع میں وہی پھلوں کے باغوں' مرغزاروں اور پیلے کھیتوں کی فراوانی تھی۔ مگر ہم اونچے پہاڑوں کی سمت جا رہے تھے۔ پہاڑ قریب آ گئے تھے اور وادی اپنے کو سمیٹتی ہوئی لگتی تھی۔ ایک مقام پر ہم نے خانہ بدوشوں کے ایک پورے قافلے کو لاری کی چھت پر بٹھایا۔ وہ اخروٹوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ لاری کے آنے پر انہوں نے جلدی سے خیمے اکھاڑے اور اپنے گھر کے سامان سمیت چھت پر بٹھا دیئے گئے۔

اپی کیورس نے چیڑھ کا دوسرا درخت دیکھا اور مجھے اس کی خوشخبری دی۔ پوست کے پھول ہوا میں ناچتے تھے اور سوات دریا اب ایک پہاڑی نالہ بنا ہمیں بلاتا تھا۔ پہاڑوں پر برف شاندار تھی۔ وہ کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتی...... پھر بید کاری کے وہی قلعے اپنے مرغزاروں میں ایستادہ تھے۔ خانہ بدوش پہاڑی عورتیں سڑک پر سے گزرتیں...... یونانی ناکوں اور تیکھے نقوش کی عورتیں ...... اور قدرے جھکی ہوئی...... سیاہ کپڑوں میں ملبوس اور وحشیانہ زیورات میں لدی پھندی۔ ان کے سروں پر گول ٹوکریاں ہوتیں

کنبے کی کل کائنات ان ٹوکریوں میں ہوتی۔ ہر قسم کے بھانڈے اور ہر رنگ کے چیتھڑے...... ان کے مرد (کاہل بدمعاش!) اپنے گدھوں اور خچروں پر سوار ہوتے۔ ان لوگوں کی زندگی سخت ہے مگر گوناگوں دلچسپی کی۔ وہ خدا کے گھر کی کھلی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور ہمیشہ ایک جگہ راہ پیما رہتے ہیں۔ دنیاوی اسباب میں غریب مگر ہر اور چیز میں امیر...... صحت میں امیر' دماغ کی مستعدی میں امیر' قناعت میں امیر' جب تک دنیا کے پاس خانہ بدوش ہیں' اسے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔

خوارزخیل...... ایک قصبہ جہاں ہم ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد پہنچے...... ایک پر رونق پہاڑی قصبہ ہے۔ یہاں پتھر کی دوکانیں ہیں...... بے شمار شگفتہ فقیر بچے' اور ملیشیا میں پولیس کے سپاہی۔ ہم ایک جگہ پر آ کر رکے۔ یہاں سے ایک سڑک نیچے پر اسرار سنہری دھند میں اترتی ہے۔ دوسری اوپر چڑھتی ہے...... خوارزخیل ہمارے لیے ایک رومینٹک' ہوشربا ناول کا پہلا باب تھا۔ یہاں سے دوسرا باب شروع ہوتا تھا اور ہم یہ جاننے کے لیے تلملا رہے تھے کہ کونسی نئی روح کے ایڈونچرز ہماری تفریح کے لیے ہمارے انتظار میں تھے۔

ہم یہاں تھوڑی دیر کے لیے بس سے اترے۔ اپی کیورس نے اپنے جرنل میں اس کے واضح تاثرات رقم کیے۔ بہت سے بچے ہمارے گرد جمع ہو گئے چمکیلے اور ہر جگہ کے بچوں کی طرح حیرانی سے پر' وہ ہمیں گول حیرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے (خوارزخیل کے بچوں کے پاس آٹوگراف بکس نہ تھیں!)

ایک گٹھیلے جسم اور کھلے خوشگوار چہرے والا پولیس کا سپاہی بندوق کندھے سے لگائے ہماری طرف سرکتا ہوا آیا۔ اس شادمان وادی کے ہر ننھے گاؤں اور بستی میں والی نے پولیس کی چوکی بٹھا رکھی ہے اور یہ سپاہی ہر وقت چوکنے اور مستعد اس ننھے گاؤں کے رہنے والوں اور راہ گیروں کی حفاظت کے لیے اس کے کوچوں میں چلتے رہتے ہیں۔ یہ سپاہی دور کھڑا پہلے ہمیں متجسس نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا تجسس اس کی جھجک پر غالب آ گیا اور اس نے آ کر ہمیں السلام علیکم کہا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ ہم نے کہا "مدین اور بحرین" اچھے آدمی نے ہمیں کس جنس کا تاجر یا بیوپاری سمجھا۔ وہ یہ خیال نہ کر سکتا تھا کہ کوئی شخص ایسی جگہوں میں ماسوا کسی کاروبار کے محض سیر کے لیے جا سکتا ہے۔ یہ کہ ایک آدمی کسی جگہ صرف سفر کے لیے یا دل کو خوش کرنے کے لیے جائے یا اس کے پاس ایسے بیکار مشغلے کے لیے وقت ہو۔ ان اچھے پہاڑی لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ ہمارے یہ بتانے پر کہ ہم کاروباری آدمی نہ تھے بلکہ صرف مسافر تھے وہ خاصا مایوس ہوا۔ اس کے پوچھنے پر ہم نے اسے اپنے نام اور عہدے بتائے اور جب ہم نے اسے اپنی ماہوار تنخواہ بتائی تو وہ اس سے کافی مرعوب ہوا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور اصرار کیا ہم اس کا نام اور پتہ اپنے جرنل میں نوٹ کر لیں

اور واپس اپنے دیس میں جا کر اسے خط لکھیں۔ ہم نے اس سے وعدہ کر لیا۔

سیٹورٹ گرینجر نے اس وقت تک ہم کو عام آوارہ گرد سمجھتے ہوئے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا بلکہ اس کا رویہ کسی قدر سرد تحقیر کا تھا۔ عبداللہ ہیڈ کانسٹیبل جیسی اہم ہستی کو ہمارے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر اسے معلوم ہو گیا کہ ہم ایرے غیرے نہ تھے بلکہ کافی باعزت آدمی تھے ورنہ ہیڈ کانسٹیبل ہمارا نوٹس کیوں لیتا۔ ہم اس کی نگاہوں میں کسی قدر اونچے ہو گئے اور خوارزخیل سے کچھ آگے جا کر وہ اپنے رویے میں اس درجہ ڈھیلا ہو گیا کہ اس نے اپنے کیپسٹن کے پیکٹ میں سے مجھے ایک سگرٹ پیش کیا۔ دراصل اس نے سگرٹ سکول ماسٹر کو پیش کیا تھا جس نے نہ پینے کا عذر کر دیا۔ اور شاید میری آنکھ کو پیکٹ پر قدرے للچائے ہوئے انداز پر پڑتے پا کر اس نے پیکٹ کو میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک سگرٹ اس میں سے لے کر سلگا لیا۔ اصولاً میں سگرٹ پیش کیے جانے پر انکار نہیں کرتا۔ (ایک عادت جس نے میرے دوستوں کو مجھے سگرٹ پیش کرنے کے بارے میں محتاط کر دیا ہے) اس رسم کے بعد سیٹورٹ گرینجر اور میں ایک طرح سے دوست بن گئے۔ لیکن اسے اردو کے دو تین لفظ آتے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ پشتو میں سکول ماسٹر سے کافی باتیں کرتا تھا۔

سکول ماسٹر نے اپنی سمٹی ہوئی جگہ میں کمی نہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا بلکہ اس نے تو اپنی ٹانگوں کو اور چوڑا کر لیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ میں سکڑ کر اور تنگ ہو کر بیٹھا تھا ایک ہم سفر کو تھوڑی سی جگہ دے دینا سکول ماسٹر کے لیے اپنی کمزوری دکھانے کے مصداق تھا۔ یہ چیز اس کی زندگی کے اخلاقی کوڈ میں نہ تھی۔ ممکن ہے وہ اس طرح ہماری طرف سے نظر انداز کیے جانے کا انتقام لے رہا تھا...... جتنا بھی میں اس سر میں اس شخص کی احمقانہ خود غرضی پر سوچتا' اتنا ہی میرا خون کھولنے لگتا۔ اس کو قتل کر دینے سے مجھے بے حد مسرت ہوتی اگر یہ کسی طرح ممکن ہوتا اور ساتھ ہی مجھے یقین ہوتا کہ میں نتائج سے بچ جاؤں گا۔

وادی اب اپنی ہیئت اور کردار میں ایک ناقابل فہم خطے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کھیتوں کے وسیع کشت زار اب نہ رہے تھے' نہ ہی پوست کے پھول ہوا میں مسکراتے تھے۔ ہم اس کے آخر تک پہنچ رہے تھے اور بتدریج اونچائی پر چڑھ رہے تھے چیڑ ھ اب زیادہ تعداد میں نظر آنے شروع ہوئے۔

بارہ بجے لاری مدین میں داخل ہوئی...... بید مجنوں اور صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی کے دامن میں ایک چوڑا لڑکھڑاتا ہوا بازار دو کانیں اور مکان سب سڑک کے ایک طرف ہیں...... زیادہ تر دو منزلہ ڈھلانی چھتیں اور لکڑی کی منقش بالکنیاں' عمارتوں کو ایک مدھم ساتبتی تاثر دیتی ہیں۔ اور مدین سوات کی بجائے تبت کا ایک شہر لگتا ہے سیدو اور منگورا کے بعد مدین شاید سوات کا سب سے اہم شہر ہے۔ مگر پر تصویر تو وہ ہے البتہ اس کی عمارتیں اداس کن اور کچھ ماتمی سی ہیں...... مجھے بتایا گیا ہے کہ مدین میں

بہت سے امیر لوگ گرما میں رہنے کے لیے آتے ہیں مگر میں مدین میں رہنا پسند نہیں کروں گا۔

ہم بازار کے وسط میں ایک چوڑے میدان میں جا کر ٹھیرے۔ اسکول ماسٹر یہاں اترا۔ وہ مدین میں چند دن رہنے کے ارادے سے آیا تھا۔ ایک دوست نے اسے بتایا تھا کہ مدین پر فضا مقام ہے اور بے حد سستا۔ وہ پشوری چپل اور شلوار قمیض میں لاری کے پاس سوٹی پر دونوں ہاتھ ٹیکے ایک اہمیت کے احساس سے کھڑا تھا...... تھوڑا سا بجھا ہوا۔ مدین میں پہنچ کر وہ اب یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے...... وہ ان مردہ گائے جیسے احمق لوگوں میں سے تھا جو کسی جگہ صرف پھل کھانے یا اس کے سستے ہونے سے فائدہ اٹھانے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے گھروں سے ہی کیوں نکلتے ہیں؟ وہاں وہ بڑے آرام اور مزے میں رہ سکتے ہیں' وہاں دو وقت کی روٹی میں بھی ناغہ کا احتمال نہیں۔ اگر ایک شخص میں خانہ بدوشی اور سفر کا اصل جذبہ نہیں' اگر وہ چیزوں اور اپنے ہم جنسوں کو ایک شاعر کی روح سے دیکھنے سے قاصر ہے تو ایسے آدمی کے لیے بہتر ہے کہ وہ سفر نہ کرے۔ ایسے آدمی کے لیے سفر میں کوئی نفع نہیں۔

ہمارے سامنے گھرے سبزے اور پھولوں کے کنجوں میں ایک قبرستان تھا۔ لاتعداد پتھر کی کنکریوں کی ڈھیریاں وہاں تھیں۔ ہر ڈھیری کے پائنتی اور سرہانے لکڑی کے پیل پائے سے نصب تھے۔ ہم نے تعجب کیا ان کا مطلب کیا ہے۔ کس قدیم مذہبی یا نسلی توہمات کی وہ نشاندہی کرتے تھے۔ شاید وہ مری ہوئی بد روح سے بری نظر کو دور رکھنے کے لیے تھے لیکن یقیناً وہ اسلامی نہ تھے۔ وہ ان لوگوں کا کافر (PAGAN) زمانوں کے وحشیانہ ٹونے ٹوٹکے تھے' اور یہ کوہستانی لوگ صدیوں کی بتدیلی مذہب کے باوجود اپنی روایات' اپنی بے پروا منشی' اپنے خون میں اب تک کافر نہیں تو ''کافرانہ'' ضرور تھے۔ اپی کیورس نے دعویٰ کیا کہ پیل پائے پیگوڈاؤں سے مشابہ ہیں اور ان کی اصل ضرورت بدھ مت سے ہوگی۔ اس نے تحقیق کی وادی کے لوگ ایک وقت میں ضرور بدھی ہوں گے۔ میں نے اس سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ بدھ کا نرم روعجز کا مذہب ان لوگوں کے مزاج اور طبعی جبلت کے ہی بالکل خلاف تھا۔ وہ اسے کیسے قبول کر سکتے تھے۔ ہماری یہ بحث مفروضات پر مبنی تھی اور پیل پاؤں کا اصل راز مجھ پر اب بھی نہیں کھلا۔

بس کے اڈے کے پاس ایک لکڑی کے بجلی کے پول سے ٹیک لگائے ایک بوڑھا خانہ بدوش جوڑا بیٹھا تھا۔ گول ٹوکری میں گھر کا سارا سامان تھا گدھا پول سے بندھا تھا سفید پریشان داڑھی والے منگول خدوخال کے بوڑھے چہرے پر بے بسی اور بوکھلاہٹ تھی۔ اس کی بیوی پچپن سال کی کھچڑی رنگت کے بالوں کی سکڑی ہوئی بوڑھی عورت تھی...... بیس پچیس سال پہلے وہ ایک پہاڑی ہیلن ہوگی۔ اب بھی اس نے اپنی اعضا کی مناسبت' اپنے تیکھے نقوش کی حساسیت نہ کھوئی تھی۔ خانہ بدوشوں کی گہری عیاری اس کی نیلی آنکھوں میں تھی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ وہ ناقابل ملامت کردار کی مالک نہ تھی اور آنکھ بچا کر چھوٹی موٹی چیزیں چرا لینا اس سے بعید نہ تھا'

مگر وہ اپنے بوڑھے کی وفادار تھی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ اب پہاڑی سے نیچے اپنے سفر کے آخیر کو پہنچ رہے تھے۔ بوڑھے جوڑوں کی رفاقت اور ایک دوسرے پر سہارے میں کوئی بڑی خوبصورت چیز ہوتی ہے اور اسی لیے شادی کا جوا کھیلنے سے کسی نوجوان کو بچنا نہیں چاہیے۔ ایک اکیلی سونی 'خودغرضانہ زندگی بلاشبہ ایک خوفناک چیز ہے۔

بحرین

ہم مدین سے چلے ...... دریا اب چٹانوں اور پتھروں نے اوپر سر پٹختا ہوا شور مچا رہا تھا۔ ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک کھلنڈرے جوان بدمعاش نے اوپر پہاڑ کی سمت مدین کے پانی سے بجلی پیدا کرنے کے اسٹیشن کی طرف اشارہ کیا۔ منگورا کو بجلی درگئی سے آتی ہے لیکن مدین کا اپنا چھوٹا سا ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن ہے ...... اتفاق سے ہم نے یہاں سوات کا امیر آدمی دیکھا۔ وہ دوہرے جسم اور چھوٹی آنکھوں والا ایک چھوٹا گول مٹول شخص تھا اور مدین کے آخری چھوٹی چاردیواری کے ایک مکان کے باہر کھڑا تھا۔

یہ یہاں کا بڑا امیر آمی ہے۔ خوش رو نوجوان نے آنکھ ماری اور اپنے سر کو اچھالا جیسے اس کو اس بات کی بڑی ہی پرواہ ہو۔

''کیا یہ سواتی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یہ سوات کا رہنے والا نہیں'' اس نے بتایا۔ مگر یہ اور بھی بہت کام کرتا ہے۔ اس کا سوات میں بڑا دھندا ہے۔ آپ جانتا ہے یہ بڑا چالاک ہے۔ ہر طریقہ سے روپیہ کمانے کا ڈھنگ جانتا ہے۔

وہ ہنسا۔ اس امیر آدمی کی چالاکی اس کے لیے بڑی مذاق کی بات تھی ...... اگر امیر آدمی اس ہنسی کو سن لیتا تو اس کو صدمہ پہنچتا اور شاید وہ کچھ حیران ہو جاتا ...... اس نے دن رات کی تگ و دو سے سوات میں اپنی حیثیت بنائی تھی۔ روپیہ کمایا تھا اور دین و دنیا میں سرخروئی حاصل کی تھی اور ایک دیہاتی نوجوان کے لیے یہ سب کامیابی ایک ہنسی کی بات تھی۔ وہ دوسروں سے زیادہ چالاک تھا اور بس! ...... دنیا کے کامیاب باحیثیت بیوپاریوں اور وزیروں کے لیے اس میں ایک سبق ہے ...... کسی جگہ' کسی وقت کوئی بے پروا نوجوان کسان یا چرواہا ذرہ بھر بھی رشک یا حسرت کے بغیر کامیاب آدمیوں کی چالاکی پر ہنستا رہتا ہے۔

ہم نے شور مچاتے ہوئے دریا کو لوہے کے ایک جدید پل سے عبور کیا۔ یہ ایک عمدہ پل تھا۔

''ادھر پہلے لکڑی کا پل تھا'' ہمارے ہم سفر نے کہا ''یہ پل پاکستانی ملٹری کے انجینیروں نے بنایا ہے۔ پہلے یہ ان سے نہیں بنتا تھا۔ وہ بنا چکتے تو پل دریا سے کچھ چھوٹا رہ جاتا تھا۔ دراصل اس پر کسی نے تعویذ کر دیا تھا۔ آخر تین چار بار کی بے فائدہ کوشش کے بعد

ملٹری کے انجینیر پیر بابا کے دربار سے ایک تعویذ لے آئے جو پہلے تعویذ کا توڑ تھا۔ انہوں نے اسے دریا کے کنارے ایک اونچا کھمبا لگا کر اس پر لٹکا تھا۔ پھر پل بن گیا کوئی دیر نہ لگی۔ اس دفعہ یہ چھوٹا نہ رہا بلکہ دریا پر پورا آ گیا۔"

میرا خیال ہے کہ کئی توہم پرست سادہ دیہاتی کسی اڑائی ہوئی اس من گھڑت کہانی میں اعتقاد رکھتے ہوں گے مگر ہمارا نوجوان سواتی ہوشیار نظر آتا تھا۔ اور اس نے باہر کی زندگی دیکھی تھی اس لیے وہ اس قصے کی اصلیت کو جانتا ہوگا۔ وہ محض دو جنٹلمینوں کو بہلانے اور الو بنانے کی خاطر گپ بازی کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم نے حیران ہونے کی بجائے اسے گپ ہی سمجھا ہے' وہ ہنس پڑا۔

سڑک اب ایک کھائی کے ساتھ ساتھ جانے لگی۔ نیچے سوات کا پانی اچھلتا اور جھاگ اڑاتا غرا اور پکار رہا تھا سواتی نے دریا کے کنارے سے اتر آنے والی ایک معصوم سی تین کونوں کی پہاڑے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ پہاڑی چند جھاڑیوں اور دوب کے سوا ایک انڈے کی طرح ننگی اور صاف تھی۔

''اس کو دیکھو'' اس نے کہا'' جو شخص یہاں کسی کو قتل کرتا ہے۔ اس کو اس پہاڑی کے اوپر لا کر کھڑا کرتے ہیں۔ نیچے سپاہیوں کا دستہ رائفلیں لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آرڈر پر وہ اس آدمی پر ایک دم گولی مارتے ہیں۔ اسے بھاگنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن آخر میں اسے گولی مار کر ختم کر دیتے ہیں۔ آدمی اوپر سے نیچے اس دریا میں گرتا ہے۔

جوان سواتی کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمکیں...... جو کچھ اس نے بتایا وہ سچ تھا یا ایک اور جھوٹ' اگر وہ پہاڑی اب خون آشام ہوگئی...... ہمارے کانوں میں ایک گولی کی گونجنے کی آواز آئی اور اپنے دل کی آنکھ کے سامنے ہم نے ایک بے چارے بدنصیب کو نیچے دریا میں گرتے ہوئے دیکھا۔ بظاہر ایک وحشیانہ طریقہ ہے مگر اس سے بہتر تھا کہ وہ تھیلے کی طرح سولی پر دم گھونٹنے سے مرے۔ پھر بھی یہ بھیانک لگتا تھا کہ ایک آدمی کو اس طور سے ایک جنگلی جانور کی مانند شکار کیا جائے۔ ہمارے ہاتھوں پر پسینہ آ گیا۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کی گزر ہو جاتی ہے اور وہ اپنی وادی میں خوش ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ خوش تھا ہم کراچی میں دو سال ایک کارخانہ میں کام کرتا رہا ہے۔ ادھر پیسہ بہت ملتا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ ہم اس کو جوے اور کھیل تماشوں میں اڑا دیتا تھا...... پھر ادھر ہمارا ایک آدمی سے جھگڑا بھی ہو گیا۔ ہم نے اسے مار دیا اور مقدمہ وغیرہ میں ہمارا سب پونجی ختم ہو گیا...... ہم پھر اپنے وطن کو آ گیا۔"

اس بدمعاش نے ایک آدمی کا خون بھی کیا تھا۔ ظاہراً اس چیز نے اس کے ضمیر پر کوئی سایہ نہ ڈالا تھا۔ اس کے لیے یہ ایک معمولی

سی بات تھی ...... ایک آدمی کا خون! اس خوبرو ہنستے ہوئے جوان کے بارے میں یہ سوچنا مشکل تھا کہ وہ قاتل ہے...... صرف ایک ہلکی سی سرد چمک اس کی آنکھوں میں ظاہر کرتی تھی کہ وہ ایک جوشیلے' آتشیں مزاج کا نوجوان تھا۔ اور یہ کہ تھوڑی سی بکی اسے آگ کر سکتی تھی ...... بحرین سے ایک میل پہلے وہ ایک چھوٹے گاؤں میں اتر گیا...... وہ یقیناً ایک ایسا آدمی تھا جس کے ہمراہ کسی اندھیری سڑک پر جانے سے پہلے میں دوبار سوچوں گا۔ لیکن وہ اپنے یونانی خوبصورت چہرے اور بے پروایانہ قدرتی قہقہے کے ساتھ ایک دل کو موہ لینے والا بدمعاش تھا!

ایک بجے کے قریب سٹورٹ گرینجر نے لاری کو ایک ہوٹل کے سامنے کھڑا کیا۔ ہم بحرین میں تھے۔ ہوٹل کے آگے ایک چٹان کے نیچے پتھر کے دو دو منزلہ بوسیدہ گھر تھے جن کے نیچے لکڑی کے ستونوں کے برآمدے تھے۔ دوسری طرف نیچے دریا رعد کی طرح گرج رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے ایک نشیب میں مڈل اسکول کی عمارت تھی...... اس کی چھت سڑک کی سطح سے کچھ اونچی تھی۔ تم اس کے روشن دانوں میں سے اندر بنچوں اور بلیک بورڈ کو دیکھ سکتے تھے!

گیرنجر نے ہمیں بتایا کہ وہ یہاں واپس ہونے سے پیشتر کچھ دیر ٹھہرے گا اور ہم سڑک پر گھروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ہم زیادہ دور نہ گئے۔ اپی کیورس کسی وجہ سے گرینجر پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں وہ ہمارے بغیر ہی نہ لوٹ جائے۔

اس اونچی سڑک پر ہم چلتے گئے۔ دریا نیچے ایک سیمیں دھند میں ملفوف بہہ رہا تھا۔ لوہے کا ایک پل اس کو پرلی طرف پار کرتا تھا۔ جہاں نیچی پہاڑیاں' بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے دور تک اکٹھی ہو رہی تھیں...... سردیوں میں بحرین کافی ویران اور اداس ہوتا ہوگا۔ پربت سے برفیلے جھکڑ بے روک اس کھلی سڑک اور اس کے مکانوں پر مار کرتے ہوں گے۔ مگر اب اس موسم میں یہ ٹھہرنے کے لیے ایک رومنٹک مقام تھا اور سینری واقعی شاندار تھی۔

''اگلی دفعہ ہم اس پل کو پار کر کے پرلی طرف جائیں گے...... دو پہاڑیوں کے اوپر۔'' میں نے کہا۔

اپی کیورس نے کہا'' ہم ٹٹوؤں پر کالام جائیں گے۔ اس سے آگے گلگت دو دن اور دو راتوں کا سفر ہے...... کسی نے مجھے لاری میں بتایا ہے۔''

''اور گلگت سے آگے ہم لیہہ اور لداخ تک جائیں گے جہاں سے لاہسہ کو سڑک جاتی ہے۔ وہاں اکیلے پہاڑوں پر بڑی بڑی بودھی خانقاہیں ہیں ہم گیروے کپڑے پہن کر لامے بن جائیں گے اور کبھی تہذیب کی طرف واپس نہ لوٹیں گے۔''

''شاید!'' اپی کیورس نے کہا ''ہم شنگری لا کو پالیں۔''

اب یہ گفتگو سب کی سب بولی نہ گئی۔ کیونکہ کئی بار دل کی باتیں زبان پر نہیں آتیں۔ ہم لوٹے۔ اپی کیورس لاری کے چلے جانے کے متعلق فکر مند تھا۔

لیکن وہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ گرینجر ابھی ہوٹل کے برآمدے میں کھانا کھانے بیٹھا ہے...... ہوٹل والوں نے ہمیں اسکول کے پاس ایک چارپائی بچھادی۔ ہم نے میٹھی چائے پی اور سامنے کے مکانوں کے برآمدوں میں بیٹھی عورتوں کو دیکھنے لگے۔ ایک یا دو بلا کی خوبصورت تھیں...... ان کے سیاہ بال دو چوٹیوں میں گوندھے اور شانوں پر پڑے ہوئے اور تیکھے چہروں پر ایک جنگلی رعنائی۔ ان کے سینوں اور بازوؤں پر پیتل کے عجب زیوارات تھے۔ یہ کوہستانی دوشیزائیں ہوشربا تھیں...... ایک بوڑھا بونا نیچے بکائن کے جنگل میں سے نکلا اس کا چہرہ سخت پروقار اور سنجیدہ تھا۔ سر سے دھڑ تک اس کا جسم ایک پورے آدمی کا تھا لیکن اس کی ٹانگیں چھوٹی تھیں۔ وہ گویا گھٹنوں تک ہی ختم ہو جاتی تھیں اور ایک عجیب بھیانک تاثر دیتی تھیں۔ یہ ایک عام بھکاری تھا۔ اپی کیورس نے اسے ایک چاندی کا سکہ دیا۔ اور بونا پھر کسی سوٹی یا بیساکھی کے سہارے کے بغیر چلتا ہوا بکائن کے جنگل میں اتر گیا...... مجھے یقین ہے کہ یہ شخص ایک بدروح تھا' وہ اس دنیا کا نہیں تھا۔

گرینجر کے کھانا کھا چکنے کے بعد ہم واپس روانہ ہو گئے...... ہم بہت کم مسافر تھے...... مدین میں ہم نے سکول ماسٹر کو ایک عمارت کے سامنے اسی طرح سوٹی پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑے دیکھا۔ وہی احمقانہ مسکراہٹ۔ خوارزخیل کانسٹیبل عبداللہ نے پھر ہمیں خط لکھنے کی تاکید کی اور زبردستی چائے سے ہماری تواضع کی...... لاری کو ہماری چائے نوشی کے خاتمے تک رکنا پڑا اور گرینجر اپنا ہاتھ گیر پر رکھے ہمیں صاف غصے سے گھورتا رہا...... تقریباً تین بجے ہم واپس منگورا میں تھے۔ پانچ گھنٹے میں چیزوں اور آدمیوں کی کتنی یادیں ہم اپنے ذہن میں لے آئے تھے۔

ایک سواتی مصنف

ہوٹل کو جاتے ہوئے ہم سوات اور چترال کے گائیڈ میپ کا پتہ کرنے کے لیے کتابوں کی ایک دوکان میں جا گھسے۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک دوسرے جسم کا سرخ و سفید شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے وہ خود اطمینانی اور فضیلت مآبی مترشح تھی جو ہر اچھے اور برے ادبی آرٹسٹ اور کتابوں کے ہر مصنف کا طرہ امتیاز ہوتی ہے' اور جو اس خوش فہمی کی پیداوار ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے ہم جنسوں سے مختلف اور برتر ہے۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

''آپ کے پاس چترال اور سوات کا کوئی گائیڈ میپ ہوگا'' ہم نے پوچھا۔

''گائیڈ میپ تو نہیں ہے۔'' اس نے کہا ''ویسے اس کی تیاری میرے زیر غور ہے'' پھر اس کی نگاہ اس ''ارمغان سوات'' پر پڑی جو ایچی کیورس کے ہاتھ میں تھی ''یہ کتاب بھی میری تصنیف ہے۔''

کیسی خوش نصیبی! ہم ''ارمغان سوات'' کے مصنف کے روبرو کھڑے تھے۔

''آپ شیخ مظفر حسین سی پی ایچ ہیں'' ہم نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں جی! آپ تشریف تو رکھیے۔'' اس نے دو کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں سوات میں بچہ بچہ میرا نام جانتا ہے ......میں یہاں سوات کالج میں لائبریرین کے عہدے پر ہوں اس کے ساتھ ہی یہ کتابوں کی دوکان کا بھی دھندا ہے۔ یہ کرسی......'' اور یہاں اس نے اپنی کرسی کے بازو پر ہاتھ رکھا ''میرے لیے تخت طاؤس سے کم نہیں ہے۔''

تخت طاؤس کا ایک ہی بازو تھا...... بعد میں ہمیں ایک دوست نے بتایا کہ جب وہ شیخ مظفر حسین کو پہلی بار دوکان میں ملا تھا تو اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بعینہ یہی الفاظ استعمال کیے تھے اور تخت طاؤس کا حوالہ دیا تھا۔

ہم بیٹھ گئے۔ ایچی کیورس نے شکایت کی کہ یہاں ٹورسٹوں کی سہولت کے لیے گائیڈ نقشے اور بول چال کی کتابیں نہیں ملتیں۔

''یہ پشتو بول چال کی کتاب ہے...... میرے پاس'' اس نے ایک خانے سے ایک کتاب نکالی'' یہ بھی میری تصنیف ہے۔ میں اس سلسلے میں مصروفیت کے باوجود کافی کام کر رہا ہوں۔ اب اس سے زیادہ بڑی اور مکمل کتاب لکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔''

اس نے پشتو بول چال کی قیمت لینے سے فیاضی سے انکار کر دیا ''آپ اسے لے جائیے۔'' کوئی کتاب فروش اپنے گاہکوں کو مفت کتابیں تقسیم نہیں کر دیتا۔ مگر شیخ مظفر حسین سی پی ایچ ایک مصنف اپنی معصوم اور بے ضرر خود نمائی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

ہم نے ارمغان سوات کے طرز تحریر اور اس کی معلوماتی اہمیت کو سراہا اس سے وہ پھول کر جامے سے باہر آ گیا۔

''والی صاحب نے اس کو بہت پسند کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور اسے محکمہ تعلیم کے اسکولوں میں بطور ٹیکسٹ بک منظور کیا ہے۔'' میں اور بھی بہت کچھ کرتا رہتا ہوں۔ میرے پاس کئی ڈرامے اور ایک دو ناول بھی لکھے رکھے ہیں۔ میرے ڈرامے پشاور ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہو چکے ہیں۔ افسوس کہ سیدو میں ریڈیو اسٹیشن تعمیر نہیں ہوا۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں اردو میں ایک ڈرامہ ''بد نصیب باپ'' تصنیف کیا تھا۔ وہ کالج میں میری ڈائریکشن میں سٹیج ہوا' بڑا کامیاب رہا...... آپ کو اس ڈرامے کے لیے ہوئے فوٹو گراف

دکھاتا ہوں۔"

اس نے اپنی میز کی دراز میں سے ایک لمبا چوڑا لفافہ نکالا۔ اسے وہ غالباً ہمیشہ دراز میں رکھتا تھا اور سب نوواردوں کو شوق سے دکھلاتا تھا۔ اس نے ہمیں فوٹوگراف دکھلانے شروع کیے۔ وہ بڑے سائز کے اور صفائی سے کھینچے ہوئے تھے۔

"میں یہاں کافی مشہور ہوں۔ اس نے ہمیں یقین دلایا۔" خود والی صاحب مجھ پر مہربان ہیں۔ میں اردو میں سوات کی پچھلی تاریخ کے موضوع پر ایک ناول "شاہین سوات" بھی لکھ رہا ہوں۔ آپ کے پاس وقت ہو تو اس میں سے ایک دو صفحے آپ کو پڑھ کر سناؤں؟"

ہم نے کہا کہ ہمیں اس وقت مرغزار جانا ہے اور وقت تھوڑا ہے۔ ہم اسے پھر کسی وقت ملیں گے۔ اس کا چہرہ قدرے ڈھلک گیا۔ پھر اس نے گرم جوشی سے ہمارے ساتھ ہاتھ ملائے۔ اور تخت طاؤس سے اٹھ کر ہمیں دوکان کے باہر پہنچانے کے لیے آیا۔ وہ ایک خوش مزاج دلچسپ آدمی تھا اور ہمیں افسوس تھا کہ ہمیں اس سے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ ملا۔ اس سے ہمیں سوات کی بڑی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

اچھے بھلے لوگ ادبی شہرت یا چھاپے کی ناموری حاصل کرنے کی فکر میں اتنے کوشاں کیوں ہوتے ہیں۔ کس معصومیت سے وہ اپنے آپ کو یقین دلا دیتے ہیں کہ وہ اول درجے کے قلمکار ہیں اور یہ کہ لوگ ان کی قدر نہیں کرتے تو یہ ان کی کور ذوقی ہے۔ شیخ مظفر حسین سی پی ایچ اچھا آدمی تھا لیکن وہ اپنے ادبی کارناموں پر بیجا نازاں تھا۔ یہ معصوم خودنمائی اسے مدھم طور پر مضحکہ خیز بنا رہی تھی ...... بہرحال وہ موجودہ سوات کی واحد نامور ادبی شخصیت تھی اور اسی لیے اس چھوٹی کتاب میں اس کا نام آجانا چاہیے۔

لاری میں سیدو آتے ہوئے حاجی سرفراز گل نے ہمیں "مرغزار" ضرور دیکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ ہیڈ کانسٹبل عبداللہ نے خوارزخیل میں "مرغزار" کی رنگینی کا ذکر کیا تھا اور "ارمغان سوات" میں شیخ مظفر حسین نے اس کے سنگ مرمر کے محل اور مسجد کو "قابل دید" قرار دیا تھا۔ اس جگہ کے حق میں اتنی قوی شہادتوں کے ہوتے ہوئے ہم نے مرغزار نہ دیکھا تو سواتی مہم نامکمل رہ جائے گی۔

چائے پینے کے بعد کوئی چار بجے ہم مرغزار جانے کے لیے نکلے۔ یہ جگہ آٹھ میل دور تھی اور ہم نے بہادری سے وہاں پاپیادہ جانے کا طے کیا...... ہم نے سیدو کی سڑک پکڑی۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ اسٹیٹ کالج کے پاس ہم نے ایک سپاہی سے پوچھا کہ مرغزار کتنی دور ہے اسے اردو کم آتی تھی۔ شاید وہ ہمیں سمجھا نہیں۔ اس نے کہا "بیس کوس" کم از کم ہم نے یہی سمجھا۔ ہم شک میں پڑ گئے "ولیعہد صاحب" کے راہنما پر ایک سپاہی نے اسے "بارہ کوس" کر دیا۔ تانگے کے اڈے

پر تیسرے نے ہمیں صاف باؤلوں کا جوڑا سمجھ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ اسے کوئی اور ضروری ڈیوٹی سرانجام دینا تھی۔ والی کی سواری گزر رہی تھی۔ ٹریفک سڑک پر روک دیا گیا۔ سپاہی اپنی اپنی جگہ پر اٹینشن ہو گئے اور موٹر سائیکل پر اسکورٹ کے پیچھے ایک سفید کھلی گاڑی والی کو لیے زن سے گذر گئی۔ ہمیں ایک طرف ہٹانے والے سپاہی نے اب آرام کا سانس لیا۔ وہ کچھ موٹا آدمی تھا۔ اس نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھے اور ہماری طرف متوجہ ہوا "ہاں اب بتاؤ...... "مرغزار ادھر سے دس میل ہے۔"

ایک تانگے والے نے تانگہ بڑھاتے ہوئے کہا "ام آپ کو مرغزار لے چلے گا۔ یہاں سے دس کوس ہے۔" ہم نے کرایہ پوچھا اس نے کہا "دس روپے ام زیادہ نہیں مانگے گا۔ یہ والی صاحب نے مرغزار جانے کے لیے مقرر کیا ہے۔ ام زیادہ مانگے تو ام کو دو سال سزا ہو جائے گا۔"

آخر ہم نے تانگے میں ہی مرغزار جانے کا فیصلہ کیا۔ دن ڈھل رہا تھا اور دس میل نے ہمیں ڈرا دیا تھا۔ پیدل ہم مرغزار آٹھ نو بجے رات سے پہلے نہ پہنچ سکتے تھے۔ چاند بھی نہیں تھا۔ اور پھر ہمیں واپس بھی لوٹنا تھا۔ ہم نے تانگہ لے کر عقلمندی کی۔

اتوار گل کوچبان کا نام تھا۔ ("ام اتوار کے روز پیدا ہوا تھا") وہ ایک سیاہ سکڑے ہوئے چہرے کا پتلا لانبا آدمی تھا...... اپنی نسوار کا رسیا۔ مجھے شک ہے کہ وہ افیون کا نشہ بھی کرتا ہوگا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں نشے بازوں کی طرح اس کے استخوانی کھینچے ہوئے چہرے میں جلتی تھیں۔ اتوار گل ایک بیحد باتونی اور یار باش آدمی تھا۔ راستہ بھر اس کی زبان ایک کترنی کی طرح چلتی رہی۔ بڑے دلچسپ اور بھلے انداز میں۔ ہم نے اس سے سوات کے بارے میں بڑے سوال کیے۔ اس نے ان کا اچھی سوجھ بوجھ اور لطف سے جواب دیا۔ بلاشبہ وہ ایک کتاب جتنا پر از معلومات تھا۔ اتوار گل حقیقتاً ایک موتی تھا۔

ہم والی صاحب کی سڑک پر گئے۔ ایک طرف سیدو کے مکان اور دوسری طرف صنوبر، سرو اور بید مجنوں کے کشت زار۔ والی کے محل کے پھاٹک پر دو کانسٹیبلوں کی گارڈ تھی۔ آگے لوکاٹ اور سیب کے ایک باغیچے کے پاس اتوار گل کا گھوڑا اڑیل پڑ گیا۔ اور ایک بھی انچ آگے جانے سے منکر ہو گیا۔ گھوڑے کے دماغ میں آنے والی آٹھ میل کی سخت چڑھائی سما گئی تھی۔ اتوار گل نے اسے چابک پر چابک لگائے آخر اسے چلانے کے لیے اس کو نیچے اترنا پڑا۔ گھوڑے نے چاروناچار اپنی قسمت کے سامنے سرتسلیم خم کر لیا۔ ہم پچیس سال سے تانگہ چلانے کا کام کرتا ہے۔ ہم سوات کا رہنے والا نہیں ہم ادھر مالاکنڈ کا رہنے والا ہے' اور اتوار گل نے چابک سے پرلی پہاڑیوں کی سمت اشارہ کیا۔ "ہم انگریز فوج کے زمانہ میں مالاکنڈ کے پہاڑوں پر تانگہ چلایا کرتا تھا۔ اس وقت ادھر سوات میں کچھ نہ تھا۔ ادھر نہ کوئی سڑک تھا' نہ سکول' نہ عدالت' نہ پولیس' یہ سب کچھ جو تم لوگ یہاں دیکھتا ہے بادشاہ صاحب کے زمانے میں بنا۔ ام ہی

سیدو میں پہلا تانگہ چلانے والا ہے۔ جب یہاں ایک ہی سڑک تھا اور وہ بھی نیچا اونچا۔ اس وقت تم کو ادھر ایک بھی پڑھا ہوا آدمی نہ ملتا۔ یہ لوگ جنگلی اور وحشی تھا۔ ڈاکہ' قتل غارت چوری عام تھا۔ کسی کا عزت' مال' جان محفوظ نہ تھا۔ سواتی لوگ کو تم نہیں جانتا۔ سخت خراب لوگ تھا۔ سگے باپ سے نہیں ڈرتا تھا...... ہم سوات کا رہنے والا نہیں ہے۔ بادشاہ صاحب نے ان کو آدمی بنا دیا ہے۔ سڑکیں' اسپتال اور سکول بنا دیا۔ پولیس کا انتظام اچھا ہے۔ اب یہاں امن ہے۔ سال میں ایک آدھ خون ہوتا ہے۔ بادشاہ صاحب ام کے لیے مثل امارے باپ کے ہے...... اتوار گل کی زبان اس طور پر چپڑ چپڑ چلتی رہی۔

اب عام محنت کش ہمیشہ اپنے آقاؤں اور حاکموں کے متعلق باتیں کرتے وقت زہر اگلنے لگتا ہے' اس کی اپنی تلخی ایام' بھوک اور مایوسی جیسا کہ قدرتی ہے۔ اسے کڑوا کسیلا بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے مالکوں کو موٹروں اور محلوں میں عیش کرتے دیکھتا ہے اور اس کے لیے محنت اور دکھ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ تم یقین کرو یا نہیں' سوات میں وہ اپنے نیک نام بادشاہ صاحب اور اس کے بیٹے سے محبت کرتے ہیں۔ اتوار گل کی طرح وہ تمہیں بادشاہ صاحب کی دانشمندی' تدبر' سوجھ اور تدبیر کی داستانیں سناتے نہ تھکیں گے۔ خوش قسمت ہیں یہ لوگ کہ ان کا ایسا بادشاہ ہے۔ (یہ شخص ایک ملکویت پرست ہے!'' ایک اشتراکی اس پر چلائے گا) لیکن ایک اچھا آدمی ایک اچھا آدمی ہے خواہ وہ تخت پر ہو یا ایک جھونپڑے میں۔ اور اپنی جسمانی اور قلبی صلاحیتوں کو انسانوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود کے لیے بروئے کار لانا...... دوسروں پر اپنے اختیارات کو خدا ترسی اور منصفی سے استعمال کرنا...... ایک سچے اور حق پرور آدمی کا ہی کام ہے۔ والی خود ایماندار ہے اس لیے سوات میں بلیک مارکیٹ کا وجود نہیں اور اس کے احکام کی حقیقتاً تعمیل کی جاتی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز میں...... خواہ وہ ہوٹل یا تانگے کا کرایہ ہو یا چائے کی پیالی کی قیمت ہو...... والی کا مضبوط' انصاف پرور ہاتھ نمایاں ہے۔ والی صاحب نے چائے کے پیالے کی قیمت ایک آنہ مقرر کی ہے۔ اور کوئی تم سے اس ایک آنے سے زیادہ نہیں مانگ سکتا اور نہ پانچ سو روپیہ کا جرمانہ ہے۔ والی صاحب نے حکم دیا ہے کہ چائے کی پیالی میں ہمیشہ کھانڈ استعمال ہوگی اور کوئی اس کے برعکس کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ پچھلے دنوں میں...... اتوار گل نے بتایا...... جب پاکستان میں چینی کی قلت تھی' والی صاحب کا انتظام اتنا خاطر خواہ تھا کہ اس جنس کی یہاں معمولی سی بھی قلت محسوس نہ کی گئی۔ کنٹرول تھا مگر ہر ایک کے لیے وافر چینی تھی...... ''یہ اس لیے ہے کہ موجودہ والی کو اپنے باپ بادشاہ صاحب سے اچھا تربیت ملا ہے۔'' اتوار گل نے کہا۔ ''بادشاہ صاحب صحیح معنوں میں درویش صفت انسان ہے۔ اب پچاسی سال کی عمر میں بھی وہ صحت مند اور مضبوط ہے۔ وہ کسی لکڑہارے کی طرح کلہاڑے سے لکڑی کاٹ سکتا ہے۔ ایک تجربہ کار گڈریے کی طرح پہاڑوں پر گلہ بانی کرسکتا ہے اس لیے لوگ اس سے دل سے محبت کرتا ہے۔''

ہم نے اب چڑھائی چڑھنا شروع کر دی تھی۔ اتوار گل نے چابک سے سامنے کے سبز پوش پہاڑ کی سمت اشارہ کیا جس پر ہمیں پہنچنا تھا...... ''وہ مرغزار ہے'' اور گھوڑے کے اتنی اونچائی پر چڑھ سکنے پر ہمارے تعجب کرنے پر اس نے یقین دلایا کہ اس کا گھوڑا تقریباً روز یہ سفر کرتا ہے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ سارے سیدو میں صرف اس کا ''تانگہ ہی ایسا ہے جو یہ سخت چڑھائی چڑھ سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ جو کچھ اس نے کہا سچ ہوگا۔ سڑک پہاڑ کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھی اور ایک لمبی وادی میں داخل ہوئی۔ دن ڈھل رہا تھا اور آغاز شام کا سونا ابھی تک درخت اور پتھر' کھلیان اور جنگل پر رکا ہوا تھا۔ وادی کے درمیان میں ایک پہاڑی پر ایک بڑا قصبہ بنا ہوا تھا...... ''کالام'' اتوار گل نے کہا۔ وادی ایک ہتھیلی کے خلا کی مانند تھی۔ پیلے کھیت تختوں کی شکل میں نچلی ڈھلانوں میں پڑے تھے اور بھیڑیں سفید روحوں کی طرح ہری دوب پر پھر رہی تھیں۔ اتوار گل نے ہمیں بتایا کہ سیدو سے ادھر کی ساری زمین...... اس وادی کی زمین...... والی کی اپنی ہے۔ اس کے مزارعین یہاں کاشت کرتے ہیں۔ آدھی فصل ان کی ہوتی ہے۔ دوسری زمین کے لیے کاشتکار کو فصل کا دسواں حصہ ہر سال مالگزاری میں حکومت کو دینا پڑتا ہے اور یہ مالگزاری جنس میں ہوتی ہے' نقدی میں نہیں۔

اس طرح ہم اوپر چڑھتے گئے...... اتوار گل کی زبان ایک ہمیشہ چلتی ہوئی قینچی تھی...... اس کا کوڑا بار بار بے چارے گھوڑے کی پیٹھ پر پڑتا تھا۔ گھوڑے نے چڑھائی کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور تم اسے الزام نہیں دے سکتے تھے۔ یہ اب دوڑنے کی بجائے چل رہا تھا اور ہر پانچ منٹ بعد ستانے کے لیے رک جاتا تھا...... آدھا فاصلہ طے کرتے کرتے وادی میں شام کے اودے اور نیلے سائے چھانے لگے۔

اچانک اپی کیورس نے (وہ تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اور اس کا منہ پربت کی طرف تھا) میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کپکپاتے ہوئے لہجے میں لفظ ''برف'' کہا۔ میں نے پیچھے مڑ کے اس کی انگلی کی سمت دیکھا۔ پرے پہاڑوں کے پیچھے اس پہاڑ پر جسے گنہگار کہتے ہیں' برف بلور کی طرح دمک رہی تھی۔ یہ ایک شاندار روح افزا لمحہ تھا میں نہیں جانتا یہ ہماری اونچائی کی وجہ سے تھا یا تانگے میں ہماری خاص پوزیشن کی وجہ سے کہ ہمیں گنہگار کی برف بالکل قریب لگی اور اس کا سرد سانس ہم نے اپنی پیشانی پر محسوس کیا پھر ایک معجزہ ہوا۔ برف نے ڈوبتے سورج کی لالی کو منعکس کیا اور وہ آگ یا خون کے گنبد بن گئی۔ اپی کیورس کی آنکھوں میں اتنے ناممکن' ناقابل حصول حسن کو دیکھ کر آنسو آ گئے۔

پریوں کا محل

گھوڑا رکتا ہانپتا تانگے کو کھینچتا گیا۔ شام کے گہرے اندھیرے میں اتوار گل اپنے چابک اور اپنی سامنے جمی ہوئی جلتی ہوئی

آنکھوں کے ساتھ اب آسیب لگنے لگا...... دوسری دنیا کی کوئی روح...... وہ مجھے کافکا کی خوفناک کہانی میں کوچبان کی یاد دلانے لگا۔ ہم ایک لوہار کی دوکان کے پاس سے گزرے اور لوہار کی دوکان ایک رومینٹک چیز ہے' خاص طور پر ایک تنہا پہاڑی سڑک پر۔ یہ اچھا آدمی اپنی دوکان میں ایک پہیئے کی مرمت کر رہا تھا اور اس کے ہتھوڑے کی ٹھکا ٹھک ہمارے کانوں سے موسیقی کی طرح ٹکرائی۔

پھر جب کہ شام ابھی یہاں گہری نہ پڑی تھی (وادی اب اودے اور ملگجی سایوں میں تھی) ہم مرغزار پر پہنچ گئے۔ اتوار گل نے تانگہ کھڑا کیا۔ (ام تم کو سب کچھ دکھائے گا) اور ہم تینوں اتوار گل کی راہنمائی میں چند سیڑھیاں چڑھ کر سیدھے پرستان میں آنکلے۔ یہ ایک وجد کی کیفیت تھی جس کے ہم نزدیک پہنچ گئے اور ہمارے دل کی کلی کھل گئی۔ بچپن کی کہانیوں میں ہم نے ایسی جگہ کے متعلق پڑھا تھا اور اس کے خواب دیکھے تھے۔ اب ہم نے پریوں کے محل کو سچ مچ اپنے روبرو دیکھ لیا۔ کوئی تعجب نہیں کہ شیخ مظفر حسین سی پی ایچ نے اس کی تعریف میں اتنی رنگینی بیان سے کام لیا تھا۔

ہمارے سامنے زمردیں گھاس کے قطعے کے حاشئے پر سنگ مرمر کے چبوترے پر ایک چھوٹا سفید محل ایستادہ تھا...... اس کا پیشیں روکار اونچے ستونوں کے ساتھ ایک یونانی فورم کا سا تھا۔ اس ننھے محل میں پھول کی ایک پتی کی سی نزاکت تھی۔ ایک غیر مرئی صفت...... یہ پریوں کا محل تھا۔ آدم زاد کا یہاں قدم نہ پڑسکتا تھا۔ پریاں اس وقت کہیں گئی ہوئی تھیں اور محل سوتا تھا۔

قطعوں میں سنگ مرمر کی مسہریاں اور آرام چوکیاں منقش میزوں کے گرد بچھی تھیں۔ اور ایک فوارہ درمیان میں پانی اچھال رہا تھا ...... دوحوض تھے...... اپی کیورس اور میں نے ایک دوسرے کو دیکھا "یکایک" ہم نے خاموش زبان سے ایک دوسرے سے کہا "وہ زیبا صورت' چنچل حسین پریزادو یہاں سے اٹھ کر کہاں چلے گئے۔ کیا ہماری آمد نے انہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا ہے۔"

اتوار گل ہمیں مرغزار کی مختلف عمارتیں اور عجوبے اس خوشی سے دکھانے لگا جیسے اس نے ہی یہ سب کچھ ایجاد کیا ہو۔ لیکن ہمیں اس وقت گائیڈ کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی موجودگی ہم پر بار ہونے لگی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ چلا جائے اور ہمیں تنہا چھوڑ دے۔

"یہ والی صاحب کے مہمانوں کے لیے ہے۔" اتوار گل نے قصر کے ساتھ برآمدوں والی عمارتوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پھر ہمیں قصر کے عقب میں سے سیڑھیوں پر ایک اور کھلی ہوا والی ہموار جگہ پر لے گیا۔ یہاں چھجوں کی ایک سبز عمارت تھی۔ یہ بھی مہمانوں کے لیے تھی۔ ہم نے کمروں میں جھانکا۔ وہ خوب سجے ہوئے اور آراستہ تھے۔ اس مہمان خانہ کے سامنے ایک فراخ کشادہ ٹیرس تھا ...... ایک جہاز کے عرشے کا سا اور اس ٹیرس پر سفید پتھر کے بنچ پڑے تھے۔ ہم نے اتوار گل سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ ہم ابھی تھوڑ

دیر تک آتے ہیں۔ اسکے جانے کے بعد ہم ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔

کیسا شاندار اور حسین نظارہ اس ٹیرس پر سے ہمارے سامنے بچھا تھا! نیچے دور تک وادی دو پاگل مسافروں کو بے خود اور متحیر کرنے کے لیے اپنا سینہ کھولے پڑی تھی۔ رنگین جھٹ پٹا اس کے اسرار اور رنگینوں پر ایک غبار کی طرح چھایا ہوا تھا۔ دہقانوں کے گھروندوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں دور کی گونجیں بن کر آتی تھیں...... مگر کون اس جادو اس حسن اس خوشی اور اس غم کی تصویر کشی کر سکتا ہے جو اس وقت اس وادی کی صورت میں مجسم تھا!

تمہیں وہاں بیٹھے ہوئے ایک سکوت اور گہرے سناٹے کا احساس ہوتا تھا اور یہ دریافت کر کے تم حیران ہوتے تھے کہ وادی چپ نہ تھی۔ یہ بڑی بھلی اور خوش آئند آوازوں سے معمور تھی اور اس کے پرندوں کی چہچہاہٹیں اور نواسنجیاں ایک لمحے کے لیے بھی بند نہ ہوتی تھیں۔ قدرت کے اس مستقل، کئی سروں کے آرکسٹرا میں روح اور خون کو ہلانے کی ایسی قوت تھی جو انسانی راگ میں کمیاب ہوتی ہے۔

آدھ گھنٹہ ہم وہاں بیٹھے رہے۔ شاید ایک گھنٹہ...... اور سائے وادی میں گھنیرے ہو گئے۔ پھر بھی رات نہ ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہ کہا اور وقت کا سب احساس کھو دیا۔ ہماری روحیں ساری ابدیت کے سمندر پر پرواز کر رہی ہیں اور ایک وقت اور ایک جگہ کے ساتھ بندھی ہوئی نہ تھیں ہم وقت اور مکان کی حدود سے باہر چلے گئے تھے۔

ٹھنڈی ہوا برفیلے گناہگار پہاڑ سے چلنے لگی۔ رات کے چند بے صبر ساتھی ابھی سے نیلگوں آسماں میں نمودار ہو گئے یہ جانتے ہوئے کہ اب اندھیرا ہونے والا ہے ہم چلنے کے لیے اٹھے۔ اتوار گل ہمیں کوس رہا ہوگا۔ مگر نیچے قصر کے پاس آ کر ہمارے دلوں نے اس سحر زدہ جگہ سے اتنی جلدی چلے جانے سے انکار کر دیا...... اور ہم دوب پر آرام چوکیوں پر بیٹھ گئے...... اپی کیورس نے اپنا کرانیکل جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیا تھا کہ وہ ان تاثرات کو ابھی ابھی مسخر کر لے جب کہ وہ تازہ تھے۔

"غنک، غنک" رنگیں جھٹ پٹے میں سے آواز آ رہی تھی۔ یہ نل سے حوض میں پانی کے گرنے کی آواز تھی...... مگر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی شوخ پریزاد کے گنگنے اور ہنسنے کی آواز نہ تھی۔ میں نے ایک مدھم سرسراہٹ سی فضا میں محسوس کی۔ یقیناً پریاں اپنے پرستان میں اتر رہی تھیں۔

اور پھر کئی برسوں میں پہلی دفعہ سجدہ کرنے اور نماز پڑھنے کی زبردست خواہش نے مجھ پر قابو پایا...... اتنی شدید اور تلملانے والی خواہش کہ یہ باقاعدہ بھوک کی ایک قسم محسوس ہوتی تھی مگر میں اپی کیورس کی تمسخر انگیز ہنسی سے ڈرتا تھا...... میں بے قرار ہوا۔

مجھے اس کی بارگاہ میں ابھی سربسجود ہونا چاہیے اور اسی جگہ...... یہ لمحہ پھر کبھی نہ آئے گا۔

''اپی کیورس'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا ''میں وضو کرنے جا رہا ہوں۔ میں نماز پڑھوں گا'' اس نے اپنے کرانیکل پر سے سر اٹھایا۔ وہ ہنسا نہیں اور اس سے میں حیران ہوا۔ ''مجھے یہ بتاؤ'' اس نے مجھ سے سنجیدگی سے راز جوئی کے انداز میں پوچھا۔ ''کس خدا کی تم نماز پڑھنے والے ہو۔ مذاہب کے خدا کی یا اس پراسرار قوت کی جو فطرت میں ہے اور ہر مادے میں جنبش کرتی ہے۔ دیکھو سوچ کر سچ بتاؤ میں یہ سب کچھ کرانیکل میں رقم کر رہا ہوں''

''میں نہیں جانتا'' میں نے کہا ''شاید اسی طاقت کی نماز جس کا ذکر کر رہے ہو...... مگر کیا مذاہب کا خدا اس طاقت سے مختلف ہے۔ کیا وہ اپنے جوہر میں وہی نہیں جو یونانیوں کا اپالو تھا' قدیم مصریوں کا حارث تھا' ہندوؤں کا شو تھا۔ اسے جو کچھ تم کہہ لو۔ اس کا تصور تم جیسے بھی باندھ لو وہ ایک ہی خدا ہے اور میں کسی اور کو نہیں جانتا۔''

اور میں نے حوض میں وضو کر کے ہری دوب پر اترتے ہوئے نورانی وجودوں کے درمیان نماز پڑھی اور ایک ایسی ہستی کی صحت و خوشی کے لیے دعا مانگی جو اس زمین پر میرے لیے سب سے پیاری چیز تھی۔

ہم وہاں ساری رات بیٹھے رہتے کہ اتوار گل بے صبر ہو کر اوپر آ گیا ''اب چلو اندھیرا پڑ گیا ہے۔ میرے پاس بتی بھی نہیں۔''

اور تاروں سے مدھم طور جھلملاتی رات میں اتوار گل (وہ اپنے چابک کے ساتھ ایک عفریت تھا) ہمیں واپس سیدو میں لے گیا۔ ہم سیدو میں ہی اتر گئے کیونکہ اتوار گل کے پاس لیمپ نہ تھا اور اسے چالان ہونے کا ڈر تھا۔ ہم نے اسے پندرہ روپے دیئے اس کے کرائے سے پانچ روپے زیادہ اور وہ اس کا یقیناً مستحق تھا...... بڑی دیر تلک ہم سیدو کے پراسرار گلی کوچوں میں گھومتے رہے اور جب ہم منگورا پہنچے تو اس وقت لو کا عمل ہو گیا۔ تب بھی ہمارا دل ہوٹل میں جانے کو نہ چاہا۔ ہم ہوٹل کے سامنے بازار میں ایک سمت سے دوسری سمت ٹہلنے لگے۔ رات ابھی جوان تھی۔ یہ ہماری منگورا اور سیدو میں آخری رات تھی اور ہماری گفتگو ادب اور فن کے بارے میں تھی جس سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی گفتگو اچھی نہیں۔ اپی کیورس اور مجھ میں پہلے بھی ادب کے تقاضوں پر بحثیں ہوئی تھیں مگر یہ بحث ان سے مختلف تھی۔ یہ ایک طلسماتی شہر میں دو پر جوش جوانوں کے درمیان ادب کی قدروں اور تقاضوں پر بحث تھی۔ میں ایک مذہبی جنونی کی حدت سے کلاسکس کے حق میں بولا۔ میں نے دعویٰ کیا ''ویکار آف ویکفیلڈ'' یا ''ٹریژر آئی لینڈ'' یا ہماری ''باغ و بہار'' ہمیشہ ہری بھری رہیں گی جب کہ سارے جدید نظریاتی یا نفسیاتی شاہکار کبھی کے بھلائے جا چکے ہوں گے۔ اپی کیورس ماڈرن انٹلیکچوئیلز (ہکسلے' جوائس اور ٹی۔ ایس ایلیٹ) کی طرف داری کر رہا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اس زمانے میں کلاسکس پڑھنا محض

وقت ضائع کرنا ہے...... یہ ایک بڑی دلچسپ گفتگو تھی' جگہ اور وقت اور موڈ نے اسے ہمارے لیے ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔ اور اگرچہ ہم ایک دوسرے سے متفق نہ ہو سکے مگر گفتگو نے ہمارے دماغوں میں ایک دمک ضرور پیدا کر دی۔

کوئی گیارہ بجے ہم ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے لوٹے۔

اور واپس

دوسرے دن صبح جب پیر گل ہمارا ناشتہ لے کر آیا درگئی جانے والی بس نیچے سڑک پر مسافروں کو بلانے کے لیے ہارن بجا رہی تھی۔ جلدی سے ہم نے ناشتہ کیا' سامان باندھا اور ہوٹل کا بل ادا کر کے بس میں آ بیٹھے۔ بل نے ہمیں حیران کر دیا...... (صرف دس روپے ہم دونوں کے لیے اور اس میں کمرے کا کرایہ اور سب کچھ شامل تھا) ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ یہ اتنا کم ہو سکتا ہے۔ شاید ہوٹل والوں سے غلطی ہو گئی تھی۔ ہم بڑے مزے اور آرام سے ایک ہوادار بالکنی والے کمرے میں رہے تھے۔ ہر کھانے پر ہم نے مرغ اور انڈے اڑائے تھے اور چائے کے لاتعداد پیالے (بالائی کے ساتھ) انڈیلے تھے۔ بجلی کو بارہ بارہ بجے تک جلائے رکھا تھا۔ اور اس سب کچھ کے لیے صرف دس روپے! کیا دنیا میں اور کوئی جگہ اتنی سستی ہو سکتی تھی!

منگورا سے ہم ایک اداس دل سے رخصت ہوئے۔ مجھے کبھی کسی جگہ کو چھوڑنے سے اتنا افسوس نہیں ہوا۔ اس خنداں وادی کو چھوڑ کر پھر اس گھٹی ہوئی عزت داروں کی دنیا کو لوٹنے کا خیال میرے لیے سوہان روح تھا۔ مگر آدمی کو لوٹنا ہی پڑتا ہے کیوں؟ میں نے اپنے سے پوچھا۔ بیشتر انسان اپنے اور اپنے مورثوں کی روایات کے بنائے ہوئے زندان میں رہتے ہیں۔ جھوٹی عزت داری اور اپنے عزیزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی جوانی اور اپنے بچپنے اور اپنے بہترین سال قربان کر دیتے ہیں وہ ساری عمر ایسے پیشوں میں صرف کر دیتے ہیں جن سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ مگر آدمی چاہے تو وہ اس زندان سے باہر آ سکتا ہے اور کھلی ہوا میں سانس لے سکتا ہے۔ قدرت کے قیمتی تحفے سب کے لیے مفت ہیں۔ پانی اور ہوا اور سورج کی روشنی کے لیے کچھ نہیں دینا پڑتا۔ (شاید بڑی صنعتی شہروں کے سوا) اور خدا سب سیلانیوں کے لیے کھلا مکان رکھتا ہے...... بڑے سے بڑے محل سے کہیں زیادہ شاندار اور نوادر سے پر۔ یہ حیران کن ہے کہ ایک آدمی کو خوش خوش زندہ رہنے کے لیے بہت کم اشیاء کی ضرورت ہے اور ایک روٹی کا ٹکڑا اور چشمے کے پانی کا گلاس اسے مکمل صحت میں رکھنے کے لیے کافی ہے۔ میں نے تہیہ کیا کہ میں اس زندان سے باہر آ جاؤں گا۔ اور اس وادی میں آ کر ان خوش و خرم لوگوں میں رہوں گا۔ شاید مجھے یہاں ایک معمولی اسکول ماسٹر کی ملازمت مل جائے۔ سکول ماسٹر کی زندگی کوئی بری زندگی نہیں۔ عزت داری کے سب اصول' دنیا بھر کے سب رشتہ دار مجھے پھر اپنے پر فریب واسطوں سے کھینچ کر اس لعنت کے

زندان میں نہ لے جا سکیں گے۔ وہ آ کر میری منتیں کریں گے۔ میں ان کی باتیں سنوں گا اور ایک سیانے چینی فلسفی کی طرح روئی سے اپنے کانوں کو دھوڑالوں گا۔

ہم درد اور حسرت کے ساتھ اس مسکراتی ہوئی جنت میں سے گزرے۔ ہم باٹا خیل میں سے گئے اور مالاکنڈ کے بھورے ننگے پہاڑوں پر چڑھے اور اترے۔ دس بجے ہم درگئی کے محصور ریلوے اسٹیشن میں تھے۔ اس واپسی کے سفر کی ایک اور اتنی ہی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ آدمی کی زندگی میں کونسا ایک دن ہے جس پر ایک کتاب نہیں لکھی جاسکتی۔ مثلاً میں اس موٹے' پلپلے' عینک لگے شخص کا حال بتا سکتا ہوں جو انٹر میں ہمارے ساتھ سوار ہوا۔ جو دعویدار تھا کہ وہ قیمتی دھاتوں کی کانیں سروے کرنے والی ایک فرم کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے اس نے ہمیں بتایا کہ اس نے چترال میں سونے کی کان کا پتہ لگایا ہے اور ہماری دلچسپی کے لیے کاغذ کے ایک تھیلے میں سے کنکر اور ریت کی ایک مٹھی نکالی۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ اس میں چمکتے ہوئے ذرات سونے کے ذرات ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ تین ہزار روپے ماہانہ کماتا ہے اور اس نے ہمیں اپنی کمپنی میں حصہ دار بنانے کی بھی پیش کش کی بشرطیکہ ہم ایک ایک ہزار روپیہ کا سرمایہ لگا سکیں۔ وہ ہمارے سگریٹ پیتا رہا اور ہماری صحبت اسے اتنی پسند آئی کہ اسے مردان میں اترنا تھا مگر وہ ہمارے ساتھ نوشہرہ تک چلا آیا۔

یا میں نوشہرہ سے پشاور کے سفر کا حال لکھ سکتا ہوں کہ کیسے ہم نے سامان پشاور کی گاڑی میں رکھوایا اور اس سے رہ گئے کیونکہ اپی کیورس نے ریفرشمنٹ روم میں کھانے پر دیر کر دی تھی۔ کیسے ہمارے سامان کا کچھ حصہ...... میری ایک کتاب اور اپی کیورس کا قیمتی کرانیکل گاڑی کے ساتھ چلا گیا۔ کیسے ہم نے ایک بس پر گاڑی کا پیچھا کیا اور اسے اس وقت جا پکڑا جب وہ پشور چاؤنی میں داخل ہوئی۔ اور بڑی خوش قسمتی سے کھوئی ہوئی چیزوں کو حاصل کیا۔

لیکن ہمارا سفر اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب ہم منگورا سے چلے اور ایک سفر سے واپسی کے بارے میں لکھنا دلچسپ نہیں ہو سکتا کیونکہ لکھنے والا اس وقت تھک چکا ہوتا ہے (اور پڑھنے والے بے پروا) اور اس کا دل اس چیز میں نہ ہو گا جو وہ لکھے گا...... نوشہرہ سے' جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے' ہم پشاور گئے اور ایک دو گھنٹے قصہ خوانی بازار میں گھومے۔ وہاں سے ہم نے شام کو میل پکڑی۔ اگلی صبح لاہور میں اپی کیورس اور میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے...... اپی کیورس کو اس دن واپس بہاولپور اپنی نوکری پر پہنچنا تھا۔ مجھے لاہور میں ایک پرانے عارضے کا علاج کرانے کے لیے کچھ دن رکنا تھا۔

یہ ہماری سواتی مہم کا خاتمہ تھا۔ بہاولپور سے روانگی کے دن سے لے کر واپسی تک ہم کل چار دن سفر میں رہے لیکن ان چار دنوں

میں جگہوں اور لوگوں کی کتنی ناقابل فراموش تصویریں ہمارے ذہنوں میں نقش ہوگئی تھیں اور کتنا لطف ہمیں ملا تھا! ان چار دنوں میں ہم اتنی مدت جیئے کہ چار دن چار مہینے ہوگئے۔ اس قدر ہمارے دماغ تاثرات سے پر تھے کہ گھر پر دو سال میں آدمی اتنا کچھ نہیں دیکھ اور سیکھ سکتا جتنا ہم نے ان چار دنوں میں دیکھا اور سیکھا اور اپنے سفر کے اختتام پر ہم نہ صرف جسمانی طور پر زیادہ صحتمند تھے بلکہ ہر طریق سے پہلے سے زیادہ سیانے اور زیادہ بہتر آدمی تھے۔ سواتی مہم نے ہماری رگوں میں گردش کرتے ہوئے خون کو نیا کر دیا تھا' ہمارے دماغ پر جمتے ہوئے میل کو دھوڈالا تھا۔ اور اسے خوبصورت یادوں کا خانہ دے کر بے اندازہ امیر بنا دیا تھا۔

◆◆◆

کاغانی مہم

ایبٹ آباد میں

یہ ایک لطیف سنہری شام تھی۔ راولپنڈی ٹرانسپورٹ کمپنی کی بس نے ہمیں اڈے پر اتارا۔ اپنے سفری تھیلوں کو کندھوں سے لٹکائے' ڈمیل اور میں کچھ دیر کھڑے نئے ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر ہم ڈھلوان سڑک پر اترنے لگے...... ہمارے قدم خوب لمبے پڑ رہے تھے۔

تھوڑی دور آگے ایک گلی کے نکڑ پر منقش شہ نشینوں والا ایک ہوٹل تھا (میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا) ہم نے اپنے سفر کے شروع ہی میں' اپنے بٹوے کو دیکھتے ہوئے' نوجوانوں کے بے پروایا حوصلے کے ساتھ' یہ طے کیا تھا کہ جو بھی ہو۔ ہم بڑے ہوٹلوں کے قریب نہیں پھٹکیں گے اور ٹھہریں گے تو چھوٹے کھلے مسافر خانوں یا سرراہے سراؤں میں۔ اس ہوٹل کے منظر نے ہمیں روک لیا۔ ہم بسوں کے دو دن کے مسلسل سفر اور رت جگوں سے تھکے ہوئے' گرد سے اٹے ہوئے اور پسینے سے شرابور تھے۔ ہم نہا دھو کر تازہ دم ہونا چاہتے تھے۔ اپنے کندھے سے لٹکائے ہوئے تھیلوں سے (جو کافی وزنی تھے) چھٹکارا حاصل کر کے ہم اس اجنبی پہاڑی شہر کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ ہوٹل غلیظ اور شرمناک جگہ ہے۔ غالباً دنیا کا ذلیل ترین ہوٹل اور سب ایماندار مسافروں کو اس سے دور رہنا چاہیے۔ ہم ہوٹل کے دروازے پر ابھی تذبذب کی حالت میں کھڑے تھے کہ ہماری بس کا ایک گول مٹول پٹھان ہمسفر (وہ ایبٹ آبادی تھا۔ اور غالباً پھل فروش تھا) اپنا سامان مزدور سے اٹھوائے وہاں سے گزرا۔

تھوڑی دیر رک کر اس نے دو پردیسیوں کو نصیحت کرنا اپنا فرض سمجھا "یہ ٹھہرنے کے لیے اچھا ہوٹل ہے۔ اس سے اچھا ہوٹل آپ کو ادھر نہیں ملے گا"...... ہم نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ (اور اب اسے بہت کوس چکے ہیں) اس کے کہنے پر ہم نے طے کر لیا اور ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

آدمی کو ایک ایبٹ آبادی اور ایک پھل فروش کی بات کا کبھی یقین نہ کرنا چاہیے۔ یہ سب مسافروں کو میری نصیحت ہے۔ ہم پتھریلی میزوں کی صفوں میں سے گزرتے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے پروپرائٹر کے پاس پہنچے۔ پروپرائٹر گول سر کا' قدرے ٹھگنا۔ سرخ و سفید آدمی تھا۔ اس کی آنکھوں اور بشرے میں کوئی ایسی چیز تھی جو گائے کی یاد دلاتی تھی۔ وہ ہمیں اصلاً ٹھس اور احمق شخص لگا۔

لیکن یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ ہمیں رات ٹھہرنے کے لیے کمرے کی ضرورت ہے۔ ہم نے اسے سمجھایا۔ ہاں وہ ہمیں کمرہ دے سکتا تھا۔ نہیں اوپر کی منزل پر نہیں وہ سب پر تھے۔ اس نے اپنے سٹاف کے بارہ سال کے ایک لڑکے کو ہمیں کمرہ براو کھلانے کے لیے کہا۔ اور لڑکا ہمیں راستوران کے پچھلے دروازے میں سے ایک پچھلے صحن میں لے گیا۔ اس کے سامنے ایک چبوترہ تھا۔ منہ پر تو بڑا چڑھا ایک گھوڑا وہاں بندھا تھا۔ دو بکریاں بھی تھیں۔ اور غالباً ایک بھینس بھی مگر میں اس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ جگہ ایک باقاعدہ ڈنگر خانہ تھی۔ ہمارا دل ہمارے بوٹوں تک ڈوب گیا۔ کمرہ نمبر ا چبوترے کے پیچھے ایک چھوٹے برآمدے والا کمرہ تھا۔ برآمدے میں گھوڑے کا چارہ بکھرا ہوا تھا۔ جب لڑکے نے کمرہ کھولا۔ تو اس میں سے مرے ہوئے چوہوں کی ایسی تیز باس آئی کہ ہم تیورا کر ہٹ گئے۔ اس میں شائید ایک مدت سیس کوئی نہیں رہا تھا۔ اور (میرا خیال ہے) صرف بہت ہی خاص مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ فرش پر جا بجا بیٹیں تھیں اور یہ بیٹیں نہایت میلی نواڑ کے دو پلنگوں پر بھی بکھری ہوئی تھیں ''کوئی اور کمرہ نہیں؟'' ہم نے لڑکے سے پوچھا ''نہیں ایک کمرہ سارے ہوٹل میں خالی تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے ساتھ غسل خانہ بھی ہے۔ غسل خانہ کھولے جانے پر مرغیوں اور مرغوں سے بھرا ہوا پایا گیا۔ ایک باقاعدہ ڈربہ مگر لڑکے نے ہمیں یقین دلایا کہ مرغیوں کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈلی جائے گی۔

کیا پروپرائٹر نے ہمیں دو آوارہ۔ سفری باؤلے سمجھا تھا؟...... محض کمرہ نمبر ا کے لائق ہمیں بڑا غصہ آیا۔ راولپنڈی میں دراصل ٹرانسپورٹ کمپنی کے مذہبی ڈرائیور نے شروع ہی سے ہمارے سفر اور ہمارے موڈ کو الٹ دیا تھا۔ اور اس کے اہانت آمیز اور گستاخانہ رویے کے اثرات ابھی تک پوری طرح زائل نہ ہوئے تھے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ جب راولپنڈی سے آتے ہوئے لاری راستے میں ایک جگہ رکی۔ تو ڈمبل اور میں پیاس محسوس کرتے ہوئے سرراہے لسی اور سوڈا واٹر کی ایک چھوٹی سی دوکان میں جا گھسے۔ میں تو اپنے لیمونیڈ کو ختم کر کے بس میں آبیٹھا۔ البتہ ڈمبل توڑی دیر کے لیے دوکان والے کو پیسے دینے کے لیے رکا۔ یہ رمضان کے دن تھے۔ ڈرائیور جو اپنے کو ایک نوع کا خدائی فوجدار سمجھتا تھا۔ روزے کی اس بے حرمتی پر جلا ہوا تھا۔ اس نے ڈمبل کا انتظار کیے بغیر بس چلا دی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ شور مچایا کہ میرا ساتھی پیچھے رہ گیا ہے۔ مگر ڈرائیور نے بڑے گستاخانہ لہجہ میں کہا ''بس اب اگلے سٹاپ پر رکے گی۔ تمہارا دوست دوسری کسی بس پر آجائے'' میں نے لال ہو کر کہا کہ اس صورت میں وہ مجھے بھی وہاں اتار دے۔ اور ڈمبل ہاتھ ہلاتا ہوا بس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ آخر ڈرائیور نے کافی دور جا کر بس روکی...... ڈمبل ہانپتا ہوا سوار ہوا اور میرے پاس آبیٹھا۔ ڈھیٹ ڈرائیور نے ہماری طرح طرح سے ہنسی اڑائی۔ منہ بنائے۔ غرض وہ ایک بے ہودہ لچر بدمعاش تھا۔ بس میں ہر

کوئی ہمیں گھور رہا تھا۔ اس متحدہ بیر کی فضا کو محسوس کر کے ہم نے ایک لفظ نہ کہا۔ رستے بھر ڈرائیور کی گستاخی سے ہمارا خون کھولتا رہا۔ اور ایبٹ آباد کے اڈے پر اترتے وقت بھی ہمارا مورال کافی نیچا تھا۔

اب اس کمرے کے منظر نے ہمیں بالکل بجھا دیا۔ پروپرائٹر نے ہماری توہین کرنے کی خاطر جان بوجھ کر یہ کمرہ ہمیں تفویض کیا تھا۔ ہم اس کے پاس گئے "لیکن اوپر سب کمرے رکے ہوئے ہیں۔" اس نے کہا۔ اس صورت میں کیا وہ کمرے کو دھلوا دے گا۔ اور غسل خانے سے مرغیوں کو ہٹوانے کا انتظام کر دے گا؟ ہم نے لال ہو کر پوچھا۔ اس نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کروا دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن بڑی دیر تک کمرے کی نہ صفائی کی گئی۔ نہ اسے دھلایا گیا۔ البتہ لڑکے نے مرغیاں کسی قدر وقت سے غسل خانے میں سے نکال لیں۔ مگر ہمارے کمرے کو صاف کرنے کی درخواستوں کو آئی گئی کر گیا۔ پروپرائٹر کچھ احمق۔ کچھ میلا سا شخص تھا۔ اس کا اپنے ملازموں پر مطلقا رعب داب نہ تھا۔

ایسا جھنجھلا دینے والا پروپرائٹر' اور ایسا بے پروا۔ عملہ! ہمیں کمرے کی صفائی کروانے میں پورا گھنٹہ لگ گیا۔ مگر صفائی کے باوجود یہ بمشکل ہی قابل رہائش تھا۔ وہاں متمکن ہو کر ہم پروپرائٹر کی ہدایت کے بموجب اوپر کی منزل پر ایک غسل خانہ میں نہائے۔ (کپڑے اتارنے کے بعد میں نے دریافت کیا کہ واٹر سپلائی میں کسی عیب کی وجہ سے پانی اوپر کی منزل پر نہیں پہنچتا۔ آخر کار میں اس گندے پانی کی بالٹی سے نہایا جو لڑکا اوپر لے کر آیا) پروپرائٹر پھانسی دینے کے لائق تھا۔ بالکل نکما اور کاہل۔ وہ بظاہر ہوٹل بزنس میں روپیہ کمانے آیا تھا۔ مگر اپنے ہوٹل کی صفائی اور مہمانوں کے آرام سے مطلقا بے پروا تھا۔ روپیہ وہ خوب کما رہا تھا۔ دوسری منزل کے کمرے رہائشی قلت کی وجہ سے مستقل رہنے والے کنبوں نے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ اور نا قابل برداشت پروپرائٹر! میں "آب حیات" کے شعراء کی نعت کا مالک ہوتا تو تیری ایک ایسی ہجو لکھتا کہ ملک بھر میں تیری اور تیرے گندے ہوٹل کی ہمیشہ کے لیے رسوائی ہو جاتی۔ اور کوئی مسافر حشر تک تیرے دروازے کا رخ نہ کرتا۔

تیار ہو کر ہم ہوٹل کے باہر آئے۔ ہم نے ہوٹل کے پاس ایک حجام کی دوکان پر شیو کرائی۔ وہ ایک باتونی نوجوان پٹھان تھا۔ اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے ہم نے اسے اپنے کاغان جانے کے ارادے کا بتایا۔ اس پر اس نے ہمیں نہایت دوستانہ طور پر اور سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ کاغان کی بجائے ہم گھوڑا گلی یا مری جائیں۔ کاغان کوئی رہنے لائق جگہ نہیں تھی۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے کہا۔ کہ وہ خود تو کبھی وادی کاغان نہیں گیا (اسے جانے کی کیا ضرورت پڑی تھی) لیکن وہ ایک دو آدمیوں سے ملا تھا جو وہاں ہو آئے تھے۔ اس کی اطلاع کے بموجب ہمارا بالاکوٹ سے آگے جا سکنا مشتبہ تھا۔ آگے برف سے ڈھپے ہوئے پہاڑ تھے۔ گھوڑا گلی جانا بہتر

تھا۔

برف سے ڈھنپے ہوئے پہاڑ! یہی تو ہم چاہتے تھے۔ میں نے ڈمبل اور خود کے' تھیلے کندھے پہ باندھے' ایک یخ بستہ ویرانی پر راہ پیائی کرتے دیکھا۔ پربت کی برفیلی ہواز ناٹے سے ہمارے چہروں پر برستی ہوئی برف کے سفید اور اونی گالے ایک غبار میں اڑاتے ہوئے...... گہرا کہرا پرے افق تک چھایا ہوا...... اتنا گہرا کہ ہم ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ سکتے۔ مگر ہم منجمد سطح پر ثابت قدم اور نڈر بہادروں کی طرح منزل کی سمت گامزن تھے۔ اس وقت یکا یک میں نے ایک لرزہ انگیز وحشت محسوس کی (ہمارے پاس صرف دو کمبل تھے) مگر ساتھ ہی بے اندازہ کوشی۔ سو اس نیک نیت حجام کے انتباہ سے ہم نے حوصلے نہ ہارے۔ ہم گھر سے یہی ارادہ باندھ کر آئے تھے کہ وادی میں پا پیادہ چلیں گے۔ رائڈر ہیگرڈ کے کرداروں کی طرح...... چلتے وقت کاغان کی بابت ہمارے دماغوں میں مبہم ترین تصورات تھے اور ہمارا خیال تھا کہ ایبٹ آباد سے ہمیں ٹٹو کرائے پر لینا پڑیں گے۔ ہم حجام کے ساتھ دیر تک باتیں کرتے رہے کیونکہ اس اچھے آدمی نے اصرار کیا کہ ہم روزہ وہیں کھولیں۔ ہم نے اس کی خوش فہمی کو قائم رکھنے میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔

روزہ کھولنے کے بعد ہم کھانے کی تلاش میں بازار گئے۔ (ہم نے فیصلہ کیا تھا۔ کہ ہم اپنے ہوٹل میں نہیں کھائیں گے) ہمیں خوب بھوک لگی ہوئی تھی۔ راولپنڈی میں بسیار تگ ودو کے باوجود ہمیں کھانے کو کچھ نہ ملا تھا۔ رمضان شریف کے احترام میں سب ہوٹل بند تھے۔ ہم نے شہر میں ایک اجلا راستوران ڈھونڈا۔ جس میں دیگچوں اور چولھوں کے پیچھے ایک سفید براق داڑھی والے بزرگ بیٹھے تھے۔ مجھے سفید داڑھیوں سے محبت ہے۔

"بسم اللہ اندر تشریف لے آیئے" الف لیلہ کے مہربان ٹمٹاتی آنکھوں والے بوڑھے نے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

خود لوٹے سے ہمارے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ خود ہمارے سامنے کھانا چنا۔ یہ ہوٹل اس شفیق بوڑھے کی موجودگی کی بدولت ایک پرانی فراموش شدہ مہمان نوازی کی روایت کا حامل تھا۔ کھانا بھی اچھا تھا اور پیسے بھی مناسب۔ ہوٹل سے ہم گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اسٹیشن پر بالاکوٹ جانے والی بسوں کے اوقات کا پتہ کرنے کے لیے گئے۔ پہلی بس کے چلنے کا وقت آٹھ بجے صبح تھا۔

گھر سے چلتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم کاغان کی سڑک پر اپنا کھانا خود پکائیں گے۔ ایک تو یہ فیصلہ غیر ضروری اخراجات بچانے کے لیے تھا۔ دوسرے ہمیں گمان تھا کہ وادی میں ہوٹل نہیں ہوں گے۔ اس کے پیش نظر ڈمبل نے اپنے تھیلے کو ضروری کھانے پینے کی چیزوں سے ٹھونس رکھا تھا۔ ان چیزوں کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ چار سیب ۲۔ شہید کی ایک بوتل ۳۔ گھی کا ایک ڈبہ ۴۔ آدھ سیر پیارز۔ تھوم وغیرہ ۵۔ کافی کا ایک ٹین ۶۔ کریم کریکرز کا ایک پیکٹ ۷۔ فرائنگ پین۔ ۸۔ تیل کا سٹو (مع مٹی کے تیل کی ایک بوتل کے)

اچانک جب ہم ہوٹل میں واپس پہنچے تو مجھے یاد آیا "ڈمبل لڑکے۔ ہم ایک بڑی ضروری چیز بھول گئے ہیں۔ راستے کے لیے ڈبل روٹی ضرور ہونی چاہیے۔" اور ہم واپس تاروں سے لدی رات میں ڈبل روٹی کی تلاش میں نکل گئے۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ ایبٹ آباد میں ڈبل روٹی کی تلاش صحرائے گوبی میں نخلستان ڈھونڈنے کے مترادف تھی۔ ہم نے ایبٹ آباد کے سب نانبائیوں کی دوکانیں چھان ماریں۔ ان کے پاس شیر مال تھے۔ کالے رنگ کے آٹے کے نام تھے۔ رس بسکٹ تھے۔ لیکن نہیں تھی تو ڈبل روٹی نہیں تھی۔ ایک بوڑھے نانبائی نے ہماری مشکل کو دیکھ کر ہمیں فلیشن میں ہوٹل کے سامنے ایک بیکری کا پتہ بتایا "سارے شہر میں یہی ایک جگہ ہے" اس نے کہا "جہاں تمہیں ڈبل روٹی مل سکتی ہے" اس بیکری میں ہمیں ڈبل روٹی مل ہی گئی۔ اگرچہ سالم کی بجائے آدھی اور کالی۔ بیکر نے وہ ہمیں اس انداز سے تھمائی جیسے وہ ہم پر کوئی غیر معمولی احسان کر رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم بھی یوں ڈبل روٹی لے کر چلے جیسے دشمن کے قلعے میں شگاف پیدا کر کے آ رہے ہیں۔

ہم برآمدے میں اپنی پتلونوں سمیت کمبل اوڑھ کر دراز ہو گئے۔ چارپائیوں میں کھٹمل تھے۔ اور مویشیوں کی وجہ سے مچھر بے شمار تھے۔ ہم بہت دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔ رات کو ایک عجیب سی "ڈبڑ ڈبڑ" سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ گھوڑا (یہ تانگے کا گھوڑا تھا) اپنا رسہ تڑوا کر سنناتا ہوا صحن کے ایک طرف سے دوسرے طرف اور پھر واپس دوڑیں لگا رہا تھا۔ دو یا تین آدمی اسے قابو میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دو تین بار اس نے ہمارا بھی رخ کیا۔ مگر پھر راستے میں ارادہ بدل دیا۔ آخر کار اس پر قابو پا لیا گیا۔ اس واقعے کے بعد بمشکل ہماری آنکھ لگی تھی کہ اچانک سارا ہوٹل جی اٹھا۔ لوگوں کے ادھر ادھر بھاگنے اور چیخ پکار کی آوازیں آئیں۔ کچی نیند میں ہم سمجھے کہ فساد ہو گیا ہے۔ مگر جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا خدا کے محبوب بندے سحری کھانے کے لیے اٹھے ہیں۔ اب سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تڑکا ہوتے ہی اپنا بل ادا کر کے (چھ روپے رات کے لیے) ہم اس ہوٹل سے جسمانی طور پر نکلے اور ذہنی طور پر بھاگے۔ جب ٹرانسپورٹ کے اڈے پر پہنچے تو پو پھٹ رہی تھی۔ اور درختوں پر پرندوں کی چہچہاٹیں شروع ہو رہی تھیں...... ہماری بس کے چلنے میں ابھی پورے دو گھنٹے باقی تھے۔

انقلابی اور اس کا ساتھی ہزاروی

چلنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہماری بس سامنے سڑک کے کنارے آ کر کھڑی ہوگئی۔ یہ ایک نیلی اور صاف بس تھی۔ اسے دیکھ کر ہمارے دل اچھلے۔ ہم ٹکٹ لے کر اس میں آ بیٹھے۔ مانسہرہ اور بالاکوٹ کو جانے والے زیادہ مسافر نہ تھے۔ ان میں ایک چھوٹے سے اخروٹ کے سے خنداں چہرے والے آدمی کو ہم نے پہچانا۔ اس نے پچھلے روز ہمارے ساتھ راولپنڈی سے بس میں سفر کیا تھا اور ڈرائیور والے قصے کے بعد اسے ہم سے ایک گونہ ہمدردی پیدا ہوئی تھی۔ اس کا دل پردیس میں دو بے چارے بے زبان اجنبیوں کی تذلیل پر کڑھا تھا۔ اور راستے میں اس اچھے آدمی نے ڈرائیور کی بدکلامی کی تلافی کرنے کے لیے ہمیں اپنی باتوں سے خوش کرنے اور پرچانے کی کوشش کی تھی۔ ہر ملک میں ایسے آدمی ملتے ہیں۔ ہنس مکھ اور مشفق لوگ جو اپنے وطن میں آنے والے اجنبیوں کی ہر طرح دلجوئی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ راولپنڈی کی بھری بس میں لے دے کے یہی ایک مسافر تھا جو ہمارا حامی اور ڈرائیور کا مخالف تھا۔ اب مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا۔ (اس نے کچھ بتایا تو تھا)...... بہر حال میں اسے اخروٹ کہوں گا۔ اس کا چہرہ اس خشک میوے کی طرح چھدرا اور شکن آلود تھا۔

بس چلنے والی تھی کہ انقلابی اور اس کا ساتھی جو اس باب کے سر پر ہیں نہایت افراتفری اور عجلت کے عالم میں پہنچے۔ ڈرائیور اور مسافروں سے اچھی طرح تصدیق کرنے کے بعد بس بالاکوٹ ہی جا رہی ہے۔ وہ اسباب اوپر رکھوا کر سوار ہو گئے۔ پچھلے روز کا پھل فروش جس کے غالباً وہ مہمان تھے انہیں سوار کرنے آیا تھا۔ اس نے ہمیں پہچان لیا۔ ''آپ بھی کاغان جا رہے ہیں؟'' اس نے کہا۔ اور پھر اس نے بڑی مسرت سے انقلابی اور اس کے ساتھی کو خوشخبری دی کہ ہم بھی کاغان جا رہے تھے اور ان کو ''سنگتی'' مل گئے۔

ہمیں سنگتیوں کی خواہش نہ تھی۔ ہم نے تو ان کے بھی کاغان جانے پر ایک دبی ہوئی آزردگی سی محسوس کی۔ انہیں کاغان جانے کا کوئی حق نہ پہنچتا تھا' اور ہمارے ان کے لیے احساسات کچھ اس قسم کے تھے جیسے عاشقوں کے اپنے رقیبوں کی بابت ہوتے ہیں۔ وضع قطع سے وہ دو کاروباری پنجابی لگتے تھے۔ ہم نے اندازہ لگایا۔ کہ ہم لاکھ ان سے دور رہنے کی کوشش کریں مگر وہ زبردستی ہمارے ساتھ چمٹیں گے۔ اور ہمیں رفیق سفر بنانے پر اصرار کریں گے۔ ہم نے قسم کھائی کہ یہ کبھی نہ ہوگا اور ہم ان کو سر پر نہ چڑھائیں گے۔ اس قسم پر عمل کرتے ہوئے ہم نے ان کی دوستانہ پیش قدمیوں کی طرف یخ ٹھنڈا انداز اختیار کیا۔ ان کے سوالا کے مختصر اور خشک جواب دیے۔ اور اپنی طرف سے انہیں یہ ذہن نشین کرانے کے سارے ڈھب برتے کہ ہمارا ان سے کوئی مطلب نہیں۔ ہم ان سے الگ مخلوق ہیں۔ اور ہماری راہیں جداگانہ ہیں۔ کیا اس سرد مہری نے انہیں ذرہ بھر بھی ہماری آشنائی حاصل کرنے کے کمینے ارادوں سے باز رکھا؟ ہرگز نہیں۔ ان کے لیے ہمارا اشارہ کافی نہ تھا۔ وہ شخص جسے میں انقلابی کہہ رہا ہوں۔ ایک تیس بتیس سالہ کچے انڈے کی

زردی کی رنگت کے چہرے کا ایک چھریرا لمبا آدمی تھا۔ دوسرے بمشکل بیس بائیس سال کا ایک موٹا۔ کسی قدر پھس پھسا آدمی تھا۔ اگلے دو دنوں میں ہمیں ان حضرت کو نہایت قریب سے دیکھنا تھا۔

آٹھ بجے بس چلی اور جلدی ہم ایبٹ آباد سے باہر مانسہرہ اور بالاکوٹ (اور کاغان!) کی سڑک پر تھے۔ پختہ سڑک ایک سیاہ فیتے کی طرح بھڑکتے ہوئے زمردیں مرغزاروں میں کھلتی جاتی تھی۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ ہم نے کیا باتیں کیں۔ پھر بھی ہم نے اپنے ساتھیوں کی زندگیوں اور ذہنیتوں کی بابت بہت کچھ دریافت کر لیا آدھ گھنٹہ انسانوں کو ایک دوسرے سے آشنا کرنے کے لیے کافی مدت ہے۔ انقلابی مطلقاً مجھے راس نہ آیا۔ (وہ ایک لاچا باندھے تھا۔ سر پر بے پروائی سے دیہاتی طرز پر لپٹا ہوا رنگدار صافہ تھا۔) وہ باتونی تھا۔ اور بالکل احمق وہ اپنی علمی اور اخلاقی صلاحیتوں کے بارے میں اپنے قد سے اونچی رائے رکھتا تھا۔ سیاسی اور اخلاقی کچرہ اس شیخی خورے کے دماغ میں بے طرح ٹھنسا ہوا تھا۔ مجھے شک سا ہے کہ وہ کچھ کچھ دہریہ خیالات کا بھی تھا۔ اپنے آپ کو اپنے ہم جنسوں سے کہیں زیادہ سیانا اور دانشمند سمجھتا تھا۔ وہ بات نہیں کرتا تھا بحث کرتا تھا۔ وہ عام گفتگو میں بھی منطق اور استدلال کا قائل تھا۔ اس کے بعض خیالات سطح پر کافی معقول لگتے تھے۔ وہ خود کو انقلابی کے روپ میں دیکھتا تھا۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ وہ حقیقت میں ایک ڈرپوک شخص ہے۔ وہ فاقہ زدہ عوام سے بڑی گہری ہمدردی کا جھوٹا اظہار کرتا تھا۔ مگر یہ زبانی اور اوپری ہمدردی تھی۔ دولت مندوں اور بڑے زمینداروں کو مطعون کرنے میں وہ تند و تیز تھا۔ اس نے کہا ''وہ مذہب کے نام پر عوام کو دھوکا دیتے اور الو سیدھا کرتے ہیں۔'' اپنی باتوں میں اس نے ایک دو بار اشارے دیے کہ اس نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا ہے۔ اور ایک بار جیل سے بھی ہو آیا ہے۔ مگر وہ غیر دلچسپ آدمی نہ تھا۔ میرا خیال ہے اس نے علم الاخلاق کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اور اسی نے اس کو کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اور اسی نے اس کو کھوپڑی کو الٹ دیا تھا۔

اس کا ساتھی ایک منسوڑہ سادہ اور بے تکلف نوجوان تھا۔ اور ہم نے اسے پسند کیا۔ اس میں بناوٹ نہ تھی۔ مزاج اور طبیعت میں انقلابی اور اس کے درمیان بعد المقطبین تھا۔ اسی لیے ان کی دوستی ہمارے لیے کسی قدر معمہ تھی۔ اس کا نام انور تھا۔ اسے ہمارے ساتھ کچھ انس سا ہو گیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ انقلابی اور انور غالباً اکٹھے شہر کے سکول میں پڑھتے رہے تھے۔ ان کی آپس میں قرابت داری بھی تھی۔ اب وہ سرگودھا میں آڑھت کے مشترک کاروبار میں حصہ دار تھے۔ یکایک ان پر کہیں پہاڑ پر جانے کا بھوت سوار ہو گیا۔ انور نے ہمیں بتایا کہ ایبٹ آباد جانے کا خیال انہیں سرگودھا میں اور کاغان جانے کا خیال ایبٹ آباد میں آیا تھا۔

ہزارے کا آدمی ضلع ہزارہ کے کسی گاؤں کے رہنے والا تھا۔ وہ پکے رنگ کا شخص تھا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس برس ہو گی۔ اس نے

ہمیں بتایا کہ وہ بھی کاغان جا رہا ہے۔ جہاں اسے وہاں کے سیدوں سے ایک ضروری کام ہے۔ اس نے اپنے خاص کام کا ایک ''اسرار'' بتایا۔ اور چونکہ ہمیں نہ اس سے اور نہ اس کے خاص مشن سے کوئی دلچسپی تھی۔ اس لیے ہم نے اس کے بیان کو جوں کا توں قبول کر لیا۔ اس نے اپنی خاندانی تاریخ پر بھی کچھ روشنی ڈالی۔ اس نے بتایا کہ اس کا بڑا بھائی بہت بڑا سرکاری افسر تھا۔ اس سرکاری افسر کے داڑھی تھی اور اب وہ رشوت ستانی کے جھوٹے مقدمات کی وجہ سے زیر عتاب تھا۔ اس نے ظاہر کیا کہ اس کا تعلق ہزارے کے ایک اچھے امیر گھرانے سے ہے۔ مگر اس کا قدرے فلاکت زدہ اور بوسیدہ سا حلیہ قطعی مختلف کہانی سنا رہا تھا۔ اس نے کاغان کے سیدوں سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا جو بقول اس کے بڑے گہرے تھے۔ اور سیدوں کی امارت۔ ان کے مکانات اور ان کی کوٹر کاروں کے بارے میں اس نے اس رشک اور فخر سے داستان طرازی کی جیسے اسے مدت سے امیروں کی کاسہ لیسی کا شرف حاصل ہو۔ اس نے اپنے خاندان اور سیدوں کی دولت کے بارے میں تو بہت کچھ بتایا۔ مگر خود اپنے متعلق اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ ہمارے بائیں کو ایک سلیٹی پہاڑ کے دامن میں کاکول فوجی اکادمی کی عمارتیں اور بیرکیں چاندی اور برف کی طرح دمکتی تھیں۔ زریں دھوپ میں نہاتے ہوئے قدرتی گلزار میں سے بس نرم لہجے میں خرخراتی نامعلوم سرزمینوں کی طرف جا رہی تھی۔ ہم نے ایک قلبی اور روحانی حظ محسوس کیا۔ اور ہماری خوشی فی الواقع بالکل مکمل ہوتی۔ اگر ہم اپنے عقب میں انقلابی اور اس کے ساتھی کی موجودگی سے آگاہ نہ ہوتے۔ ان کی موجودگی کی حقیقتی مسرت کے احساس میں کانٹے کی طرح کھٹھ کھٹھ جاتی تھی۔

روانہ ہوتے وقت بس قریب قریب خالی تھی۔ راستے بھر وہ اکے دکے دہقانی مسافروں کو سوار کرتی رہی اور اگلے گاؤں تک پہنچتے پہنچتے بالکل بھر گئی۔ فرنٹیر گورنمنٹ بسوں میں ایک قاعدے کی پوری طرح پابندی کی جاتی ہے۔ وہ مقررہ تعداد سے زائد ایک بھی سواری کو جگہ نہیں دیتے۔ مسافروں کے ساتھ جوان اور خوشرو کنڈکٹر کا برتاؤ دھیما اور شریفانہ تھا۔ اس سے میرا یہ تاثر گہرا ہو گیا کہ سرحد کے لوگوں میں پنجابیوں سے زیادہ حسن سلوک۔ شائستگی اور نظم کا مادہ ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم پنجابی کسی قدر اکھڑ اور درشت لوگ ہیں۔ میں نے نوٹ کیا۔ کہ گلابی بھرے گالوں کا ستھرا کنڈکٹر بس کے بھر جانے کے بعد راہ میں انتظار کرتی سواریوں کو جگہ دینے سے انکار کرتے وقت بھی تند اور سخت کلام نہ ہوتا۔ وہ ایک شرمیلی آنکھوں والا نرم دل جوان تھا۔ کیا اس کے لہجے اور الفاظ کی ملائمت اور اس کی نرم طبیعت اس خطے میں بسنے والی نسل کی مظہر تھی؟ بس سروس میں ملازم ہونے سے پہلے وہ ایک ناپختہ سادہ دہقانی لڑکا تھا۔ اور اپنے پہاڑی گاؤں کی غریبانہ۔ مسرت کی زندگی نے اسے اپنے ہمسایوں سے محبت اور شرینی کا برتاؤ سکھا دیا تھا۔ وہ مسافروں سے اس طرح پیش آتا گویا وہ اس کے اپنے گاؤں کے شریک اور رشتہ دار ہوں۔ اس کے اپنے چاچے اور بھائی۔ اپنی بہنیں' خالائیں اور

پھوپھیاں۔

ہم مانسہرہ کی اصل وادی میں داخل ہوئے۔کون اس وادی کے صحیح حسن کی تصویر الفاظ میں کھینچ سکتا ہے۔یہ زمرد اور سونے کی وادی ہے۔اوران گنت دوسرے رنگوں کی کن کا کوئی نام نہیں۔فطرت کے ان رنگوں میں ایک ایسا دھیما پن ہے۔جیسے مصور نے انہیں ایک ہلکے موقلم سے صرف چھولیا ہو۔اس میں جنگلی پھولوں کے قطعے شوخ رنگین آگوں کی طرح بھڑکتے ہیں۔مگر آدمی اس کی گریزاں خوبصورتی کو بیان کرنے کی کوشش سے مایوس ہوجاتا ہے۔وادی کے پاس آکر سڑک اتنی سیدھی نہ رہی۔یہ ایک سنپولیے کی طرح بل کھاتی سڑک بن گئی۔پیچوں اور موڑوں کی سڑک۔اس وقت تک ہم تقریباً ہموار میدان میں سفر کرتے رہے تھے۔سڑک اوپر چڑھنے لگی۔حیرت سے بھری نظروں سے ہم ہر نئے منظر کو دیکھتے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہر لحظہ ورق الٹتا۔

دس بجے ہم مانسہرہ پہنچے۔اخروٹ نے یہاں ہمیں الوداع کہی۔بس یہاں آدھ گھنٹہ ٹھہری۔ہم بازار میں گھومے جو اچھا خاصا ہے۔مگر پچھلے روز کے تجربے کی بنا پر ہم نے کچھ پینے یا کھانے کی جرات نہ کی۔مانسہرہ سے آگے بس سنجیدگی سے اونچے پہاڑوں پر چڑھنے لگی۔چیڑھ۔دیوادار اور صنوبر کے شاندار جنگل تھے۔اور نیچے بہت نیچے سبز پوش گھاٹیاں دیکھ کر دل حلق میں آکر دھڑکنے لگتا تھا۔پہاڑ ختم ہوگئے۔اور اتار شروع ہوا۔بند انجن کے ساتھ بس سرکتی گئی۔ہم ایک مسرت بخش ترائی میں اترے۔اور شوریدہ کنہار کو لکڑی کے ایک عجیب سے پل سے عبور کر کے بس ایک دوکان کے سامنے رکی۔سامنے ایک سلیٹی پہاڑ کے پس منظر میں گڑھی حبیب اللہ کے سفید لمبے مکان گویا مکعب ڈبوں کی صورت ایک دوسرے پر بڑی صفائی سے جمے ہوئے تھے۔کافی مسافر یہاں اترے۔ گڑھی حبیب کوٹ آزاد کشمیر کی سرحد پر ہے۔۔کنڈکٹر نے ہمیں بتایا کہ بس یہاں آدھ گھنٹہ ٹھہرے گی۔ڈمبل اور میں پل پر سے گزر کر ندی کے پرلے کنارے ہلاتے ہوئے سبزے پر سگرٹ پینے آبیٹھے۔ہمیں وہاں بھی امن وسکون میں نہ رہنے دیا گیا۔کیونکہ انقلابی پارٹی (ایک اور آدمی بھی ان کے ساتھ تھا) نے ہمارا پیچھا کیا۔اور وہ ہم میں آملے ہم نے ان کو نظرانداز کیا۔مگر سب بے سود تھا۔آدھ گھنٹے کی مدت میں اپنے ان ناگریز ہم سفروں سے سرد مہر اور الگ رہنا ممکن نہ تھا۔اور ہم نے اپنے نوشتہ تقدیر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

وہ ایک بے ضرر اور خوش صحبت آدمی لگتا تھا۔تین چار بار سیدوں سے ملنے کاغان میں سفر کر چکا تھا۔اس لیے اس نے ہماری نظروں میں ایک ایسے شخص کا وقار حاصل کرلیا تھا جو انجانے خطرناک مقامات کے چپے چپے سے واقف ہو۔

آدھ گھنٹے تک ہم ہری دوب پر لیٹے اپنے ہم سفروں سے باتیں کرتے رہے۔کنہاریاں ایک بڑی نہر ہے۔سکون سے اپنے سبز

گل پوش کناروں کے درمیان لیٹی ہوئی۔ وقت۔ خوبصورت دریا۔ اور ہمارے رومانٹک گردوپیش نے ہمارے ساتھیوں کی باتوں کو ایک مبالغہ آمیز رنگینی اور دلچسپی دے دی۔ اور ہمارے دل قدرے نرم پڑ گئے۔ ''یہ کوئی ایسے برے ساتھی نہیں۔'' ہم نے سوچا۔ انقلابی بھی اپنی علیت اور استدلال کے باوجود اب قابل برداشت تھا۔

جب ہم بس میں سوار ہونے کے لیے وہاں سے اٹھے تو چاروناچار ''سنگتی'' بن چکے تھے۔

ہزارے کا آدمی مہم کا لیڈر ہیٹا ہے

جب ہم گڑھی حبیب اللہ سے چلے۔ سورج کافی اونچا چڑھ آیا تھا۔ دن گرم ہونے لگا تھا۔ بس اسی سڑک پر جانے لگی جس پر ہم آئے تھے۔ پھر وہ ایک موڑ پر آئی۔ ایبٹ آباد کی سڑک یہاں سے بائیں کو جنوبی سمت جاتی تھی اور بالاکوٹ سڑک دائیں کو۔ ہم بالاکوٹ کی سڑک پر موڑ گھومے۔ یہ سڑک مطلڈ تو نہیں ہے پھر بھی بسوں کے قابل ہے۔ بالاکوٹ گڑھی حبیب سے صرف دس میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر بس نے اس فاصلے کو طے کرنے میں ناقابل یقین دیر لگائی۔ گڑھی سے آگے سیبری پال کیلگوئن کی پینٹنگ کی طرح عجیب۔ اور اذیب زدہ ہے۔ مانسہرہ کی وادی کی طراوت دینے والی شادابی اور ہریالی یہاں نام کو نہیں۔ خال خال اناج کے کھیتوں کے ٹکڑے نظر پڑتے ہیں۔ زمین کی شکل جلی اور جھلسی ہوئی ہے۔ اور پہاڑیاں مانسہرہ کی پہاڑیوں کی طرح رنگین نہیں ہیں۔ وہ بیمار سی پہاڑیاں ہیں جو دلوں کو مرجھا دیتی ہیں۔ سڑک کبھی کنہار کی ندی کو کھو دیتی ہے۔ کبھی پالیتی ہے۔ اس راستے کا ایک منظر تو میرے ذہن میں انمٹ طور سے جم گیا ہے۔ خشک گھاس کی وحشتناک پہاڑیاں نیم دائرے میں نیم دائرے میں ہمارے گرد گھیرا ڈال چکی تھی اور سامنے سیاہ پانی کا ایک جوہڑ تھا جو زہر کا ایک جوہڑ لگتا تھا۔ یہ منظر نہایت لرزہ انگیز تھا' وہی تاریک افسرہ کیفیت جو ایڈگرایلن پو کی کہانیوں پر ایک موٹے غلاف کی طرح چھائی ہوتی ہے۔

تقریباً دو بجے ہم ایک ڈھلوان کی چڑھائی چڑھتے ہوئے بالاکوٹ میں داخل ہوئے۔ کنہار پر لکڑی کے عجیب سے پرانے پل۔ اور پرے اونچے بھورے پہاڑوں کے ساتھ بالاکوٹ بڑا پرکشش اور رومانٹک نظر آتا تھا۔ کم از کم بس کے راقم الحروف مسافر کا دل تو اسے دیکھ کر اچھل پڑا۔ یہ ان شہروں میں سے ہے جنہیں مسافر ایک بار دیکھ لینے کے بعد عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ اور جو آدمی کی یادوں کے البم میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ تم انہیں اپنے دفتر کے سٹول پر سے ناگہانی تخیل میں دیکھتے ہو۔ تمہارے اندر کوئی چیز روشن ہو جاتی ہے۔ اور اپنی بک بک کی بے مقصد زندگی میں تم خوشی کا جزیرہ پالیتے ہو۔ ایسے شہروں کو تم ہر مایوسی اور ندھیرے کے وقت بلا سکتے ہیں۔ ایسی یادیں ہی زندگی کا اصل سرمایہ اور اس کے دکھوں کا مداوا ہیں۔ ان کے بغیر کون سیاست کے تیز وتفنگ۔

حاکم کی خلقی اور پانخوت امیر کے بالا وجہ رعب کے باوجود دنیا کی وقابل برداشت پا سکے گا! بالا کوٹ وادی کاغان کا دروازہ ہے۔ سطح سمند سے اس کی بلندی ایبٹ آباد سے بہت کم ہے۔ چلچلاتی۔ درخشاں دوپہر میں یہ شہر میدانوں کے کسی شہر کی طرح پک رہا تھا۔ بس پی ڈبیو۔ ڈی کے ریسٹ ہاؤس اور ایک دو اور عمارتوں کے پاس سے گرتی ایک چھوٹے ہوٹل کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ یہاں سب لوگ اترے۔

سڑک کے پار ایک بلندی بڑی عمارت تھی۔ اس کے سامنے جنوبی سمت پر ایک برمدہ تھا۔ پانچ چھ جیپیں وہاں دھوپ میں کڑی جل رہی تھیں۔ یہ حکومت سرحد کی جیپیں تھیں۔ جو مسافروں کو کاغان کی وادی میں لے جاتی ہیں۔ وہ اجلے نیلے رنگ میں رنگی ہوئی' کھلی جیپیں تھیں۔ اور بڑی اچھی حالت میں تھیں۔ ہمارے سنگی اور ہم سامان کو سامنے کے چھوٹے ہوٹل میں اتروا کر جیپوں کے اڈے کی طرف گئے۔ عمارت کا برآمدہ ایک فراخ ہوادار شیڈ تھا۔ کسی قدر پی۔ ڈبلیو۔ آر (سابق این۔ ڈبلیو۔ آر) کے تیسرے درجہ کے مسافر خانے کی طرز پر بنا ہوا۔ شیڈ میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر جیپوں کے پٹھان ڈرائیور لیٹے تھے۔ ایک دو نیند میں مست تھے۔ انقلابی ہم سب میں پرگو تھا اور گھنٹوں تک ایک دلچسپ مگر احمقانہ اور طفلانہ گفتگو سے محفل کو گرمانے کا فن اسے خوب آتا تھا (اس خوبی کا اعتراف نہ کرنا غلط ہوگا) میں ایک عورت کی طرح شرمیلا ہوں اور عام گپ بازی میں بالکل نہیں چمک سکتا۔ اس افسوسناک کمی نے میری ذہن کو خواہ مخواہ گھٹا ہوا اور بوجھل بنا دیا ہے۔

انقلابی نے ڈرائیوروں سے بے تکلفانہ پوچھ گچھ شروع کر دی۔ اور انہیں جلد ہی دوست بنالیا۔ ڈرائیور صحت مند' خواش باش اور زندہ دل تھے۔ ان میں سے ایک کی شخصیت نے ہمیں بڑا متاثر کیا۔ وہ ایک کڑیل اونچ خوبصورت شخص تھا۔ ضلع جگت اور پھبتی بازی میں اطاق اور ہر قسم کے چٹکلوں کی پوسٹ۔ حسین جان اس کا نام تھا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کو کہا اور اس میں اور انقلابی میں مزے کی چوٹیں ہوئیں۔ حسین جان نے ہمیں بتایا کہ اس وقت یا شام کو کوئی جیپ کاغان میں نہیں جاتی۔ جیپیں صبح جاتی ہیں اور ہمیں رات بالا کوٹ میں بسر کرنی پڑے گی۔ ''خو'' اس نے کہا ''تم وادی کاغان میں کیا کرنے اور کیا دیکھنے آتا ہے۔ میں تو اس روز روز کے چڑھنے اترنے سے تنگ آچکا ہوں پچھلا سال ادھر کسی کالج کا بیس پچیس طالب علم آیا تھا۔ دسمبر کا مہینہ میں یہ سامنے کا پہاڑ اور اس کے آگے سب برف تھا۔ وہ پیدل کاغان جانا چاہتا تھا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ خوا پس چلے جاؤ۔ اوپر سردی میں کیا کرنے جاتا ہے۔ زندگی سے بیزار ہے۔ انہوں نے میری بات نہ مانا۔ اور اوپر چڑھ گیا۔ ام ادھر مزے سے بیٹھا آگ تاپتا۔ انہیں پہاڑ چڑھتا دیکھتا تھا۔ دو دن کے بعد وہ لوگ واپس آیا۔ سردی سے مرغا بنا ہوا۔ چار کو نمونیہ ہو گیا۔ ایک کا ٹانگ ٹوٹ گیا۔ چار کا بازو پٹی میں بندھا تھا۔ ادھر

ہے کیا۔ پہاڑ ہے اور کیا"

حسین جان نے انقلابی کو کاغان کی سڑک کے خطرات سے بہت ڈرایا۔ جیل میں جانے کے باوجود انقلابی بے حد "چوزہ دل" شخص تھا۔ اور ڈرائیور نے یہ بھانپتے ہوئے کہ یہ سخت ڈرپوک ہے۔ اس کے دوسوسوں کو اور ہوا دی۔ وہ سڑک کے خطرات کو مبالغہ آمیز طریقے سے بیان کرتا اور ہمیں مذاق میں شریک کرنے کے لیے آنکھ مارتا۔ جب اس نے یہ کہا کہ ہر سال ایک آدھ جیپ اوپر سے الٹ کر نیچے کنہار میں گر جاتی ہے۔ تو انقلابی کا چہرہ منقلب ہوگیا۔ ہم اس کی پریشانی اور بدحواسی کا لطف لے رہے تھے۔ ڈرائیور کے قصوں نے اس کی ہمت کو مکمل طور سے پست کر دیا۔ اور اسے یقین ہو چکا تھا۔ کہ کاغان میں جانا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کاغان جانے کا ارادہ ترک کر کے وہیں سے لوٹ جانے پر بالکل آمادہ تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہم اس کے خدشات پر اندر ہی اندر ہنس رہے ہیں۔ اور اسے بے حد بزدل سمجھ رہے ہیں۔ تضحیک کے اس خیال سے اس نے اپنے آپ کو کاغان کے سفر کے لیے مضبوط کر لیا۔ اور وہ اپنی قیمتی زندگی کو ہماری معمولی زندگیوں کے ساتھ خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا۔ جو تھوڑی سی مصیبت بھی نہیں جھیل سکتے۔ میں حیران تھا کہ پھر وہ جیل کیسے چلا گیا۔ (اگر وہ واقعی اپنے دعوے کے مطابق جیل جا چکا تھا۔

حسین جان نے ہمیں گورنمنٹ جیپ ڈرائیوروں کی سخت زندگی کے بارے میں بتایا اس میں کسی قدر شیخی کو دخل تھا۔ اور ہمیں مرعوب کرنے کی خواہش کا بھی اور اس نے اپنی عادت کے بموجب جیپ ڈرائیور کی مشکلات اور سختیوں کو دس گنا زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ (یہ زندگی اتنی بری اور غیر دلچسپ نہ تھی جتنی وہ اسے ظاہر کرتا تھا) اس نے کہا۔ کہ کاغان کی سڑک پر جیپ چلانا بڑے تجربہ کار ڈرائیور کا کام ہے۔ ہر سال گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے بہترین ڈرائیوں کا اس کام کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے۔ کڑے معائنے وغیرہ ہوتے ہیں۔ اسے اور دوسرے ڈرائیوروں کو ایک سو پچاس روپے تنخواہ ملتی ہے۔ اپنے جیپ ٹرانسپورٹ کے منیجر کے لیے وہ تعریف سے پر تھا۔ اس نے کہا "وہ سرحد کا ماہر ترین ڈرائیور ہے۔ اور نہایت شریف آدمی ہے۔ (تم لوگ اس سے ملا ہے کہ نہیں ملا ہے؟) ...... حسین جان تعلیم یافتہ اور ہوشیار لگتا تھا۔ وہ ایک بے حد پر مذاق اور دلچسپ گفتگو کرنے والا تھا۔ اور اس میں مضحکے کی تیز حس تھی۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر آدمی حیران ہوتا تھا کہ ڈرائیوروں کی نسل بھی اتنی ذہین اور سمجھدار ہو سکتی ہے۔ خواہ اس نے سکول کا منہ دیکھا تھا یا نہیں اس کی گفتگو ہمارے بیشتر تعلیم یافتہ لوگوں سے کہیں زیادہ دلچسپ اور پر مغز تھی۔ میرے خیال میں اس نے انسانوں اور چیزوں کے بارے میں وسیع علم کھلی سڑک پر سے حاصل کیا تھا۔ جو اسٹیونسن کے الفاظ میں سب سے بہتر اسکول

ہے۔

دوسرے دو ڈرائیور مقابلتاً کم سخن اور سنجیدہ طبع تھے۔ اور ان میں سے ایک (عبداللہ خان اس کا نام تھا) متانت اور امتیاز کا پیکر تھا۔ منان خان چالیس سالہ لمبا دوہرے جسم کا پٹھان تھا۔ خاموش اور شریف النفس۔ وہ ہر وقت کسی فکر یا سوچ میں کھویا رہتا تھا۔ اور ایک جیپ ڈرائیور سے کہیں زیادہ وہ ایک پر وقار اور باتدبیر ڈپلومیٹ لگتا تھا۔

جیپ ڈرائیوروں کے متعلق ایک بات میں نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنے مختلف مزاجوں کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کافی الفت رکھتے تھے۔ ان کا یہ دور کا اسٹیشن جہاں وہ اپنے بیوی بچوں سے مہینوں کٹ جاتے تھے۔ ان کے پرخطر کام کی نوعیت ان کی زندگی کی تنہائی اور یکسانیت' یہ سب چیزیں انہیں ایک قسم کی جلاوطنی کا احساس دلاتی تھیں۔ ان حالات میں چھوٹی چھوٹی رقابتیں اور حسد کے جذبے کم ہی پنپ سکتے تھے۔ اور ان تنہا پہاڑوں نے انہیں گویا خونی رشتے میں جوڑ دیا تھا۔ جب ان میں سے ایک کوئی بات کرتا تو وہ اپنے سب ساتھیوں کی بھی ترجمانی کرتا تھا جیسے وہ سب ایک کنبہ ہوں۔ ایک قبیلہ ممکن ہے ان میں کبھی کبھار چھوٹی ناخوشگوار چپقلشیں رونما ہو جاتی ہوں۔ اور مزاج بھڑک اٹھتے ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ وہ ان باتوں کو جلد بھول کر ایک دوسرے سے صاف ہو جاتے تھے۔ میں نے ان کو ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی کرتے نہیں سنا۔ اس کے برعکس وہ اپنے ساتھی کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ وہ سب کے سب اپنے منیجر کی شرافت اور تجربے کی اتنی بڑا چڑھا کر مدح سرائی کرتے تھے کہ گمان ہوتا تھا یا تو منیجر کوئی فرشتہ ہے یا ایک بڑا پہنچا ہوا ولی۔ مشہور ڈاکٹر سیموئیل جانسن نے ایک بار سکاٹ لینڈ کے باشندوں کے بارے میں ایک پھبتی کسی تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کی تعریف کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ یہ بات جیپ ڈرائیوروں پر بالکل صادق آتی تھی۔

ہم نے نیچے کے چھوٹے ہوٹل سے چارپائیاں منگوا کر شیڈ کے نیچے ڈلوا دی تھیں اور مزے سے بیٹھ کر اپنے آئندہ کے اقدام کے بارے مجلس مشاورت طلب کی۔ ڈمبل اور میں نے ان لوگوں کو یہ محسوس کرانے کی کوشش کی۔ کہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ کہ ہم پیدل کوہ پیمائی کرنے کے ارادہ سے آئے ہیں۔ یہ انقلابی کو عجیب سا لگا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم ایسی حرکت پیسے بچانے کے لیے کرنا چاہتے تھے۔ وہ حیران تھا کہ ایسی جگہ پیدل چل کر مصیبت کیوں جھیلی جائے۔ جہاں موٹر جا سکتی ہے۔ اور اگرچہ اس نے کہا نہیں لیکن وہ صاف طور سے ہمیں یا تو سر پھرے سمجھتا تھا یا سخت کنجوس۔

مگر اس کے موٹے ساتھی انور نے ہمیں شرمیلی الزام دینے والی آنکھوں سے دیکھ کر پنجابی میں کہا ''ہم سنگت کے لیے جا رہے ہیں۔ ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں۔''

انور کو ہم سے انس سا ہو گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں اور لہجے میں ایسی التجا تھی کہ ہم نے دل ہی دل میں ان کے ہمراہ جیپ میں ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس کا دل نہ توڑنا چاہتا تھا۔

انقلابی ہمیں۔ اور خاص طور پر مجھے ناپسند کرتا تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے متاثر ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اسے شبہ تھا کہ میں اس کی بزدلی پر چپکے سے ہنستا رہا ہوں۔ مگر اس ناپسندیدگی نے (جو سراسر مشترکہ تھی) اسے بڑی بے تکلفی سے میرے سگرٹ پینے سے نہ روکا۔ ہم نے ایبٹ آباد میں یہ سوچتے ہوئے کہ آگے سگرٹ نہ ملیں گے گولڈ فلیگ کا ایک ٹن خرید لیا تھا۔ میں نے اپنے ٹین سے سگرٹ ضرورت سے زیادہ فیاضی سے پیش کیے اور انقلابی نے ایک بار بھی انکار نہ کیا۔ اور نہ ہی ہزارے کے آدمی نے اور مجلس مشاورت کے اختتام پر وہ آدھے ٹین کو بڑی ڈھٹائی سے پھونک چکے تھے۔ انقلابی نے قینچی کا ایک پیکٹ اپنے کرتے کی جیب میں چھپا رکھا تھا۔ اور وہ عقل کا پکا اور گانٹھ کا پورا ہونے کی وجہ سے سوچ رہا تھا۔ کہ وہ مجھے خوب الو بنا رہا ہے۔ ڈمبل نے مجھ سے زیادہ عملی ہوتے ہوئے مجھے آنکھ کے اشارے سے اپنے سگرٹوں کو ضائع کرنے سے منع کر دیا۔

اب مجلس مشاورت کے بارے میں دو تین لفظ جو شوریدہ کنہار کے کنارے اس شیڈ میں منعقد ہوئی! ہزارے کا آدمی اس عام حقیقت کے طفیل کہ وہ ان علاقوں کا رہنے والا تھا۔ اور کاغان کئی بار ہو آیا تھا' اس مہم کا لیڈر مان لیا گیا۔ میرا مطلب ہے کہ کسی نے اسے لیڈر منتخب تو نہیں کیا۔ نہ ہی ہم نے اس سے یہ کہا کہ اب سے وہ لیڈر ہے (اس سے اس کا دماغ خراب ہو جاتا) لیکن ہم نے اس کی لیڈری کو چپکے سے تسلیم کر کے اس کی راہ نمائی اور ہدایات کی پیروی کرنے کا فیصلہ کیا۔ سیدوں کے ساتھ اس کی دوستی نے اسے خاص طور پر ہماری نظروں میں قابل قدر بنا دیا۔ لیڈر کاغان تک جا رہا تھا۔ مگر ہماری دوستی اور حفاظت کی خاطر وہ ناراں تک جانے کو تیار ہو گیا۔ مجلس مشاورت میں میں بھی طے پایا کہ اب سے سب کا کھانا مشترک ہو۔ اور بجائے اس کے کہ پارٹی کا ہر فرد جدا جدا خرچ کرے۔ ایک ہی شخص اکٹھا سب کے لیے خرچ کرتا رہے۔ بعد میں کل اخراجات کو پارٹی کے افراد کی تعداد (جو پانچ تھی) تقسیم کر لیا جائے اور ہر کوئی اپنے حصے کی رقم خزانچی کو ادا کر کے حساب صاف کر دے۔ یہ تجویز میرا خیال ہے' ہزاروی سے آئی۔ انقلابی نے مناسب اور مدلل الفاظ میں اس پر صاد کیا۔ انہوں نے مجھے خزانچی کا عہدہ سونپنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے کچھ تو اپنے سنگتیوں کے آگے پیچھے سے ناواقفیت اور کچھ اپنے محدود فنڈز کی بنا پر یہ سعادت قبول کرنے سے معذرت چاہی۔ کچھ پس و پیش کے بعد موٹا انور خانچی بننے اور حساب رکھنے پر تیار ہو گیا۔

اس کے بعد ہم کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ جب میں جاگا تو نیچے ہوٹل کے سامنے ایبٹ آباد جانے والی چار بجے کی بس تیار کھڑی

سواریاں چڑھا رہی تھی۔ انقلابی اور خزانچی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ مگر ہزاروی غائب تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے ہزاروی کو بس کی طرف سے چہرے پر نورانی مسکراہٹ لیے آتے دیکھا۔ اس آدمی کی مسکراہٹ جس نے اپنے کسی بھائی سے کوئی بھلائی کی ہو۔ نیک دل اور غمگسار ہزاروی! اس نے مجھے بتایا کہ ہماری بس میں اس کا ایک ''گرائیں'' اور اس کی بیوی بالاکوٹ میں حضرت اسمٰعیل شہید کے مزار پر منت ماننے کے لیے آئے تھے۔ اب وہ واپس جا رہے تھے کیونکہ یہ اس دن کی آخری بس تھی۔ اور انہیں رات کو وہیں ہوٹل میں ٹھہرنا پڑ رہا تھا۔ ان کے پاس صرف واپسی کا کرایہ تھا۔ اور ہوٹل میں ٹھہرنے کے لیے پیسے نہ تھے۔ ہزاروی نے قبول خود ان کو اس پریشانی سے نجات دلا دی تھی۔

''میں نے ہوٹل میں ان دونوں کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا ہے۔'' ہزاروی نے ایک ایسے شخص کے سے فخریہ انداز میں کہا۔ جس کا کام ہی مصیبت زدوں کے کام آنا ہو۔ ''میں نے اس شخص کو پانچ روپے بھی خرچ کے لیے دے دیے ہیں۔ میری طبیعت ہی ایسی ہے۔ ایسے موقعے پر جو انسان دوسری سے ہمدردی نہ کرے۔ وہ بھی کوئی انسان ہے۔'' ہزاروی نے انسانی ہمدردی پر ایک چھوٹی سی تقریر کی اور مجھے اپنی روپے کے معاملے میں دریادلی کی ایک اور کہانی سنائی۔ جس میں اس نے دو سو روپے اپنے چند نادار دوستوں پر بغیر کسی خیال کے خرچ کر ڈالے تھے۔ میں ہزاروی کی اس کریم النفسی سے بے حد متاثر ہوا۔ انقلابی اور خزانچی کے اٹھنے پر ہزاروی نے انہیں بھی بتایا کہ کس طرح اس نے بس سے رہے ہوئے ''گرائیں'' کی امداد کی تھی۔ ہم نے خیال کیا کہ ہزاروی دل کا واقعی اچھا ہے تاہم میں باوجود کوشش بسیار کے زندگی میں اس کے مقام کو معین کرنے سے قاصر رہا۔ ہزاروی نے میرے ٹن میں سے برادرنہ بے تکلفی کے ساتھ سگرٹ نکال کر سلگایا۔

چار بجے جب دھوپ ہلکی ہوئی تو ہم بالاکوٹ کے شہر کو دیکھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارا شیڈ اونچائی پر تھا۔ اس لیے سارے شہر کا دلفریب منظر ہمارے سامنے تھا۔ بازار کی لڑکھڑاتی پتھریلی گلی۔ لکڑی کا کئی سالہ پل۔ ابلتا۔ غراتا اور دہاڑتا ہوا دریا۔ پرے کنارے پر پانی میں ڈوبے ہوئے مرغزار اور پہاڑ کے اوپر چڑھتی ہوئی پتھریلی سڑک کی لکیر۔ ڈمبل اور میں اس شہر میں پھرنے کے لیے بے قرار تھے۔ اور اگر ہمارے سنگیوں کا بوجھ ہم پر نہ ہوتا۔ تو ہم گرمی کے باوجود کبھی کے نکل چکے ہوتے۔

ہم چلنے لگے تو حسین جان نے انقلابی کو انگلی کے اشارے سے بلایا ''دیکھو ادھر آؤ۔ ہمارا بات مانو......'' وہ اسے رازداری کے انداز میں ایک طرف لے گیا جیسے وہ اس سے خاص مروت سے پیش آ رہا ہو وہ ادھر ایک بڑا اچھا جگہ ہے۔ وہ پہاڑی ہے نا۔ اودھر ایک گندھک کا چشمہ ہے۔ وہاں ضرور جانا۔ وہاں تم غسل وغیرہ بھی کر سکتا ہے۔ اچھا۔ بابو ضرور جاؤ'' اس نے انقلابی کی پتلی نوکدار

ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا۔

اڈے سے اتر کر ہم پانچ ''سنگی'' بالاکوٹ کے مختصر بازار میں سے گزرے۔ بازار ایک ڈھلوان پتھریلی سڑک ہے۔ پل کے ادھر پانچ چھ اچھی خاصی دوکانیں ہیں۔ کچھ منیاری کی۔ ایک دو پھلوں کی۔ بازار میں پٹھانوں کے گدھے اور اونٹ جابجا نظر آتے تھے۔ بالاکوٹ کاغان اور گلگت کے تجارتی قافلوں کی راہ پر ہے۔ اور گرما میں یہ قافلے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس شہر کی یاد میرے دماغ میں بے سکت بوڑھے آدمیوں۔ اپاہجوں۔ کوڑھ۔ جذام اور رعشہ کے مریضوں سے مربوط ہے۔ ان عوارض میں مبتلا لوگ آس پاس کے شہروں سے یہاں گندھک کے چشمے میں نہاتے ہیں۔ مگر خود باشندے اتنے صحت مند نہیں۔ ان میں سے بیشتر کے چہروں پر مٹی کی رنگت کی زردی ہے۔ مدقوقوں کی سی زردی۔ خدا جانے یہ سیلی اور غیر صحت مند آب وہوا کا اثر ہے یا ان لوگوں کی انتہائی غریبی اور فاقہ کشی کا۔

اچھلتے۔ شور مچاتے کہنار کو عبور کر کے ہم ایک اور بازار میں سے گزرے۔ جہاں چھوٹی غریبانہ پتھریلی دوکانیں ہیں۔ زیادہ تر خالی۔ بوڑھے آدمی ان میں بیٹھے تھے۔ وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟ وہ کیا بیچ رہے تھے۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ کھردری سڑک اوپر چڑھنے لگی۔ دوکانیں ختم ہو گئیں۔ ساڑھے چار کا وقت تھا۔ اور پھر بھی تیز گرمی تھی۔ اوپر محصولی پھاٹک پر آ کر ہم نے سڑک کو چھوڑا اور ایک جھلسے ہوئے چٹانی راستے پر سے ہوتے ہوئے گندھک کے چشمے پر پہنچے۔ جس کو دیکھنے کی حسین جان نے اس قدر تاکید کی تھی (یہ شاید اس کا کوئی مذاق تھا) یہاں پتھر کے چند ٹکڑوں کے بیچ میں سیدرا ذرا سا گندا پانی ابل رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی سراپا مشت استخوان۔ جو رعشہ کا مریض تھا اور جس کا ایک پاؤں خوفناک طریق سے سوجا ہوا تھا۔ چشمے کے پاس اس جگہ کی بدروح کی طرح بیٹھا تھا۔

ہم وہاں اس بوڑھے آدمی کے ساتھ ایک سایہ دار جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ نہانے والوں کے لیے ایک چھوٹا سا حمام چشمے کے قریب ہی ایک نشیب میں بنا ہوا تھا۔ چشمے کا پانی اس میں ایک ٹونٹی میں سے نیچے گرتا ہے۔ بوڑھے آدمی نے ہمیں بتایا کہ وہ پچاس میل دور ایک گاؤں سے اپنے سوجے ہوئے پاؤں کے ساتھ اس چشمے میں نہانے کی خاطر آیا ہے یہ چشمہ کسی پیر کی کرامات سے جاری ہوا تھا اور اس کے پانی میں جسم کے کئی روگوں کے لیے شفا تھی ''اس میں ضرور نہاؤ'' اس نے کہا ''یہاں دور دور سے لوگ نہانے آتے ہیں'' انقلابی' ہزاروی' خزانچی اور ڈمبل باری باری کپڑے اتار کر حمام میں جا کر نہائے۔ مگر میں نے ان کے پیہم اصرار کے باوجود نہانے سے انکار کر دیا۔ دراصل میں سلاخ کی طرح پتلا ہونے کی وجہ سے دوسروں کے سامنے کپڑے اتارنے

سے خوف کھاتا ہوں۔ ایسا کرنے سے میں مرجانے کو آسان سمجھتا ہوں۔ دونوں صورتوں میں انسان تماشہ بنتا ہے۔ مگر موت کے بعد تماشہ بننا سہل تر ہے۔ کیونکہ انسان کے حواس اس میں شریک نہیں ہوتے اور اس کی موت کو اس سے سب سے کم تعلق ہوتا ہے۔

ہم سوجے ہوئے پاؤں والے بوڑھے کو اسی طرح چٹان پر بیٹھا چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہوئے میں نے تعجب کیا کہ اپنے اس پھولے ہوئے پاؤں سے بوڑھا اس چشمے پر کیسے پہنچا ہوگا۔ اور اب وہ کیسے بیس میل دور اپنے گاؤں کو پہنچنے کی امید رکھتا ہے۔ لیکن ایسے غریب بوڑھے آدمیوں کے لیے ہم فکر کیوں کریں۔ ایسے بیمار بڑھے تو اس ملک میں کثرت ہیں۔ دن ابھی تک گرم تھا۔ اور چٹانیں دہک رہی تھیں۔ کچھ وقت ہم نے کنارے کنارے حضرت اسمٰعیل شہید کے مزار پر گزارا۔ اس کے بعد ہم لوٹے۔

مجھے نہانے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ چار پانچ دن سے مجھے نہانا نصیب نہ ہوا تھا (ایبٹ آباد کے ہوٹل کا نہانا نہ نہانے کے برابر تھا) آخر نہانے کے لیے مجھے جگہ مل ہی گئی۔ پل کے پرے۔ بس کے اڈے کے بالکل نیچے کنہار کے کنارے پر حاموں کی ایک قطار تھی جس میں پانی اوپر ایک چشمے میں سے آتا تھا۔ کئی مکروہ عوارض کے آدمی وہاں نہا رہے تھے۔ اور ان کے اندر جانے کے لیے گھٹنوں گھٹنوں تک کھڑے پانی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ جگہ پرائیویٹ تھی اور انسان پبلک میں کپڑے اتارنے کی ذلت سے بچ جاتا تھا۔ ڈمبل اوپر سے دوڑ کر تولیہ اور صابن لے آیا۔ اور میں نے سب سے آخری حمام میں برف کے سے ٹھنڈے پانی کی دھار کے نیچے غسل کیا۔ نہانے کے بعد میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے لیے میرا جسم نیا نیا تیار ہوا ہے۔

شام کو میں اور ڈمبل کنہار کے کنارے کنارے دور نکل گئے۔ ہم انقلابی وغیرہ سے تھوڑی دیر کے لیے فرار چاہتے تھے۔ کچھ آگے جا کر ہم کنہار کے کنارے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم نے کیا باتیں کیں مگر شام پڑ گئی اور کنہار کا پانی تھوڑے سے وقفے کے لیے زعفرانی ہو گیا۔ پھر سفید سکے کے رنگ کا...... اور پھر سامنے کی چھوٹی پہاڑیوں کے پیچھے سے تیرھویں کا بڑا سا پیتل کے رنگ کا چاند طلوع ہوا۔ اور یہ طلسم دریا اور لکڑی کے پل اور اس عجیب شہر پر اتر آیا۔

دیر تک ہم وہاں بے خود بیٹھے رہے۔ مجھے ابھی تک اس پائپ کا ذائقہ یاد ہے۔ جو میں نے کہنارے کے کنارے اس سحر زدہ سکوت میں پیا

انقلابی کے کردار کا مزید مطالعہ

جب ہم واپس آئے تو ہمارے تینوں ساتھی شیڈ کے سامنے کی کھلی جگہ پر چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ پاس ہی افطاری کی ایک دعوت ہو رہی تھی۔ جیپ ڈرائیوروں نے اس پر اپنے فرشتہ سیرت مینجر کو مدعو کر رکھا تھا۔ یہ اسی کی دعوت تھی۔ ڈرائیوروں کا انداز اپنے

منیجر کے ساتھ کچھ اس قسم کا تھا جسے ماتحتانہ ادب ولحاظ اور دوستانہ شناسائی کے مابین ایک مصالحت کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے منیجر سے آزادی سے باتیں کرتے تھے لیکن انہیں اس کا بھی احساس رہتا تھا کہ ان کے تعلقات کے درمیان ایک حدِ فاصل بھی ہے جسے پھاند جانا ان کے لیے مناسب نہیں۔

دعوت ختم ہوئی تو حسین جان مجھے ایک طرف لے گیا "دیکھو تم لوگ منیجر صاحب کو کہہ کر صبح کے لیے جیپ ریزرو کرالو۔ بہت سا دوسرا کاغان جانے والا مسافر یہاں آیا ہوا ہے۔ اور اگر تم کو کل جیپ نہ ملا۔ تو ایک دن اور بالاکوٹ میں جرہنا پڑے گا۔ منیجر صاحب بڑا اچھا آدمی ہے۔ وہ جیپ ریزرو کرا دے گا۔" مجھے شک پڑتا ہے کہ حسین جان نے یہ بات اپنے منیجر کی اہمیت جتانے اور ہمیں ایک طرح سے زیر بار کرنے کے لیے کی۔ کیونکہ اس دن اڈے پر صرف ہم ہی کاغان جانے والے مسافر تھے۔ میں منیجر سے ملا۔ وہ کھانا کھا کر اپنی رہائش گاہ جا رہا تھا۔ وہ ہم سے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔

اس نے فوراً ہمارے لیے جیپ ریزرو کرنے کا وعدہ کیا اور کہا کہ ٹکٹ وغیرہ ہمیں صبح سویرے دفتر سے مل جائیں گے۔

ہم نے نیچے ایک چھوٹے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ وہ سگرٹ کا ٹیس جو میں نے ایبٹ آباد میں خریدا تھا اب بالکل ختم ہو چکا تھا۔ سب سگرٹ انقلابی اور ہزاروی پھونک گئے تھے؟ کھانے کے بعد انقلابی نے سگرٹوں کے ختم ہو جانے پر تشویش کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ سگرٹ کے پیکٹ یہیں سے خرید لینے چاہئیں۔ پتہ نہیں وادی میں سگرٹ ملیں یا نہ ملیں۔ ہزاروی بھی انقلابی کی رائے سے متفق تھا۔ ہم نیچے بازار میں سگرٹ خریدنے کے لیے اترے...... ایک دوکان پر کیپسٹن کے سگرٹ تھے۔ اور انقلابی نے مجھے راستہ کے لیے دس بارہ پیکٹ خرید لینے کا مشورہ دیا۔ لیکن میں نے اپنا سبق سیکھ لیا تھا۔ انقلابی کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا کہ وہ اپنے لیے سگرٹ خریدے۔ وہ اور ہمارے لیڈر صاحب' اب بھی میرے ہی سگرٹ پینے کی امید لگائے ہوئے تھے۔ میں نے کیپسٹن خریدنے سے انکار کر دیا جو دوکاندار کے پاس سب سے بڑھیا برانڈ تھا۔ "میں گولڈ فلیک کے سوا اور کوئی سگرٹ نہیں پی سکتا۔ ورنہ میرے حلق میں خراشیں ہو جاتی ہیں" میں نے اپنے دو ساتھیوں کو بڑی خوش مزاجی سے اطلاع دی۔ میں نے اعلان کیا کہ میں اپنا پائپ پیوں گا۔ انقلابی اور ہزاروی دونوں کے چہرے لٹک گئے۔ انقلابی تو یقیناً مایوسی اور غصے سے مجھ پر دانت پیس رہا تھا۔ اس کے باوجود نہ انقلابی نے سگرٹ خریدے نہ ہزاروی نے۔

ہزاروی کی بات اور تھی۔ وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ ہمیشہ حقہ پیتا ہے اور یہ کہ وہ محض کبھی کبھار شوقیہ ایک آدھ سگرٹ پی لیتا ہے۔ دن کو وہ چھوٹے ہوٹل سے حقہ منگوا کر پیتا رہا تھا۔ اور اس کی نے مستقل طور پر اس کے اور ہزاروی کے دہانوں میں گردش کرتی رہی تھی۔

جب اسے سگرٹ پیش کیا جاتا۔ تو وہ حقے کی موجودگی کے باوجود اسے قبول کر لیتا۔ وہ اسے کان میں اڑس کر کسی اور وقت کے لیے بچا رکھتا۔ انقلابی بھی حقہ گڑگڑانے لگتا تھا۔ اور پھر ڈھٹائی اور بے حیائی سے میرے سگرٹوں پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ اس شخص کے پاس گرہی حبیب اللہ میں قینچی کا ایک پیکٹ ضرور تھا (اس کی میں قسم کھا سکتا ہوں) اس میں سے اس نے مجھے کمال فراخدلی سے ایک سگرٹ بھی پیش کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ گولڈ فلیک وغیرہ نہیں پیتا۔ ان کا تمبا کو خالص نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک پاکستانی سگرٹوں میں قینچی بہترین تھا۔ لیکن بالا کوٹ میں اس نے قینچی کے پیکٹ بھی نہ خریدے اس نے سوچا ہو گا کہ اس کے پاس سگرٹ ہوئے تو ممکن ہے دوسروں کو پلانے پڑیں۔ وہ ان سیانوں میں سے تھا۔ جو گانٹھ کے پورے ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ انتہائی درجہ کا خود غرض تھا۔ ہر وقت اپنے فائدے اور آرام پر اس کی نظر تھی نہ جانے ایسے لوگ کس منہ سے عوام کے دکھوں اور مصائب کا ذکر کرتے ہیں۔ شاید یہ محض دوسروں پر اپنی خطابت اور فصاحت کی دھاک بٹھانے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ شخص حد درجہ کم دل تھا' مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کو بچانے کے لیے اپنی چھنگلی کٹنے کا بھی روادار نہ ہو گا۔ تاہم اسے باتیں کرتے سن کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ عوام کا سارا درد اکیلے اس کے سینے میں ہے۔ ایسے لوگ صرف اپنے منہ سے بات کرتے ہیں۔ اپنے دل سے نہیں اور آدمی کو ان کی انسان دوستی کی باتوں سے فریب میں نہ آنا چاہیے خواہ وہ کچھ بھی کہیں۔ کتنے ہی آنسو ئے بہائیں۔ دو اور دو ان کے لیے ہمیشہ چار رہیں گے۔ دنیا کا سارا علم ایسے انسانوں کی سرشت کو نہیں بدل سکتا۔ (انقلابی کے لیے اتنا کافی ہے۔)

گیارہ بجے ہم سو گئے۔ ٹھنڈی ہوا گونجتے ہوئے کنہار سے چل رہی تھی۔ اور سیمیں چاند صاف آسمان پر سے دریا اور پل اور پہاڑ پر چمک رہا تھا۔ اس کھلے چبوترے پر بھی جہاں ہم دن کے تھکے ہمارے سنگی' ابھی سے نیند کی گود میں تھے۔

وادی میں

حسین جان نے ہمیں علی الصباح جگا دیا۔ ہم نیچے منیجر کے دفتر (ایک دو کمرے کی پتھریلی عمارت) میں گئے۔ ناران تک کے ٹکٹ خریدے اور حسین جان کی ہدایت کے بموجب میز پر پڑی ہوئی کتاب میں اپنے نام اور پتے درج کیے۔ اس کتاب میں ایک خانہ تھا جس میں مسافر جیپ ٹرانسپورٹ سروس کے بارے میں اپنی رائے یا مشورے دے سکتے تھے۔ میں نے اس خانے میں منیجر کی شرافت۔ جس سلوک اور شائستہ برتاؤ کی تعریف میں پانچ چھ سطریں لکھیں۔ منیجر اس وقت اس رائے کو پڑھنے کے لیے وہاں موجود نہ تھا۔ بعد میں جب اس نے اسے پڑھا ہو گا۔ تو میرے الفاظ نے اس کے دل میں دمک پیدا کر دی ہو گی۔ وہ اس بات سے بھی خوش ہوا ہو گا کہ رائے کا دینے والا کوئی عطائی یا لوفر نہ تھا۔ بلکہ حکومت کا ایک گزیڈ آفیسر ایس ڈی او اور صوبہ سرحد میں ایس ڈی او کی ابھی تک

وقعت اور شان باقی ہے۔

انقلابی نے کتاب میں میرے پتہ کے ساتھ ایس ڈی او دیکھ کر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پھر یوں خاموش ہو گیا جیسے اس کے سینے پر بہت سے سانپ لوٹ گئے ہیں ہزاروی نے مجھے تعریف کی نظروں سے دیکھا۔ جیسے میرے پر نکل آئے ہوں اور میں یک لخت فرشتہ بن گیا ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کتنی تنخواہ لیتا ہوں۔ جب میں نے اسے اپنی تنخواہ بتائی تو اس کی نگاہوں میں میری قدر اور بڑھ گئی اور فوراً ہی اپنے کو میرے بابر کرنے کے لیے اس نے ایک خالہ زاد بھائی دریافت کر لیا جو میری طرح ایس ڈی او تھا۔

دن ابر آلودہ تھا۔ پرلے پہاڑوں پر امڈتی گھٹائیں اتر رہی تھیں بارش کے خطرے کی وجہ سے جیپوں کی چھتیں اور کھڑکیاں جما دی گئیں۔ ہم سامان وغیرہ رکھ کے عبداللہ خان کی جیپ میں پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ منیجر بھی اگلے گاؤں تک ہمارے ساتھ آ رہا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ فرنٹیر پولیس کا آئی جی اگلے دن کاغان میں ارہا ہے۔ اور اسے شوگراون کے ڈاک بنگلے پر انتظام وغیرہ درست کرنا ہے۔ ایک بیڑے کی شکل میں جیپیں اڈے سے نکلیں اور عجیب سے پل کو عبور کر کے ڈھلانی پتھریلی سڑک پر چکر لگاتی ہوئی اوپر چڑھنے لگیں۔ جلد ہی ہم کافی بلندی پر پہنچ گئے۔ بالاکوٹ نیچے دھوپ میں اپنے پل کے ساتھ ایک کھلونے کا سا دلفریب شہر بن گیا۔ ہزاروں فٹ نیچے اچھلتا کودتا سیمابی کنہار تنگ وادی کے دو پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک زخمی اژدہے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ خطرناک معلوم ہوتا تھا اور نیچے دیکھنے سے کلیجا منہ کو آتا تھا۔ انقلابی کے چہرے پر خون کا ایک قطرہ نہ رہا۔ وہ سخت متوحش تھا۔ اور یہ سفر اختیار کرنے پر ابھی سے پچھتا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ سنبھل گیا۔

سڑک تنگ۔ پتھریلی اور ناہموار ہے دراصل یہ خچروں اور اونٹوں کے لیے ایک چٹانی پگڈنڈی تھی جسے چوڑا کر کے جیپوں کے لائق بنا دیا گیا ہے۔ اس میں پرخطر اور ناگہانی موڑ ہیں۔ اور بعض جگہ اتنی تیز ڈھلوانیں کہ جیپ کو چاروں پہیوں کے زور سے چڑھنا پڑتا ہے۔ یہاں ایک ہنڈولے میں اوپر جانے کا احساس ہوتا ہے۔ ڈرائیور کو چوکنا ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ اس کی آنکھ تیز ہونی چاہیے۔ اور گیروں اور سیٹرنگ پر اس کا مکمل قابو لازمی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان جیپ ڈرائیوروں کے لیے اس سڑک پر ڈرائیونگ عادت کے باعث خطرناک نہیں رہی۔ اس سڑک پر جیپ چلانا ان کا روزمرہ کا معمول ہے اور انہیں پتہ ہوتا ہے کہ کہاں خطرناک موڑ ہیں۔ اور کہاں تقریباً عمودی چڑھائیاں۔ ایک دفعہ ہم موڑ گھومے تو اچانک جیپ سڑک کے کنارے پر ہزاروں فٹ نیچے کنہار کے اوپر خطرناک طور پر ٹنگی ہوئی تھی۔ ہم سب کے دل سرد ہو گئے۔ خود منیجر نے زرد ہو کر جیپ کی چھت کی سلاخ میں ہاتھ ڈال دیا۔ اگر پہیہ ایک انچ بھی سڑک کے ادھر جا پڑتا تو یقیناً جیب الٹ کر نیچے غصیلے کنہار میں جا گرتی۔ اور آپ یہ سفری روئداد نہ پڑھ رہے ہوتے۔

بعض وقت میں تقریباً خواہش کرتا۔ کہ ڈرائیور سٹیرنگ میں تھوڑی سی لغزش کھا جائے گا۔ اور جیپ اپنے انسانی بوجھ کے ساتھ چٹانوں پر قلابازیاں کھاتی نیچے کنہار کی جوشیلی ہل چل میں جا پڑے گی۔ یہ اس قسم کی تمنا تھی جو انسانوں کو خطرناک طور پر جینے اور موت سے کھیلنے پر اکساتی ہے۔ جو ایک چھوٹے بچے کو ایک لپکتی ہوئی موٹر کار کے سامنے سے بھاگ کر گزرنے کی حماقت پر آمادہ کرتی ہے۔ موت ایک خوفناک چیز ہے۔ لیکن اس میں ایک عجیب کشش ہے (یہی وجہ ہے کہ بیشتر پرانے شاعر شعروں میں اپنے جنازے کا تصور باندھنے کے عادی تھے) کوئی باہوش آدمی' مجھے یقین ہے' مرنا نہیں چاہتا۔ اس کے باوجود کتنے ہی آدمی ایسے ہیں جو نہایت خطرناک کاموں میں اپنی جان کو داؤ پر لگا کر لذت محسوس کرتے۔ جرمن بوہل جو اکیلا رات کو آخری کیمپ سے نانگا پربت کی قاتل چوٹی کو فتح کرنے کے لیے نکلا تھا۔ ضرور جانتا ہوگا کہ اس کے زندہ سلامت لوٹنے کے امکانات تقریباً صفر تھے۔ کیا اس خیال نے اسے اپنے عزم میں ذرا بھر بھی متزلزل کیا۔ بالکل نہیں وہ برفیلے طوفانوں اور گرجتے اولانشوں کی خوفناک ویرانی میں تن تنہا نکل کھڑا ہوا۔ اور اپنی واحد آہنی قوت ارادی کے بل پر چوٹی پر جا پہنچا۔ اور وہ لوٹ بھی آیا۔ گو جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آیا تو اس کے دونوں پاؤں یخ بریدہ تھے۔ اور اس نے اپنے ہوش تقریباً کھو دئے تھے۔

یہ بہتر ہے کہ آدمی بستر میں اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں کیں گھل گھل کر مرنے کی بجائے پہاڑ کی چوٹی یا دریا کہ لہروں میں مرے۔ یہ اور بھی بہتر ہے کہ لوگ آپ کے فانی جسم کو نہ پا سکیں۔ اور اس کے اوپر مٹی کی ڈھیری نہ بنا سکیں۔ ذاتی طور پر میں بستر میں مرنے سے ہول کھاتا ہوں۔

بالاکوٹ کی پہاڑیاں تو ننگی ہیں مگر جوں جوں اوپر جائیں چوٹیوں اور ڈھلانوں پر صنوبر' چنار دیودار کے جھنڈ نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اور اردگرد کی دنیا بھڑکیلی سبز ہو جاتی ہے۔ قدرت کے ہاتھ نے کاغان کی وادی کو بڑے پیمانے پر ڈیزائن کیا ہے۔ پہاڑوں میں وقار اور آن بان ہے۔ اسی طرح اس کے شاندار جنگلوں میں وراس کی ہریالی میں ایک بھرپور افراط ہے۔ کنہار ایک سچے رفیق کی طرح کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو پایا۔ چاندی کا ایک لہراتا ہوا سانپ۔ وادی بڑی تنگ ہے۔ آپ اسے دریائے کنہار کی وادی بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوش طرف اونچے سبز پوش پہاڑ ہیں اور ان کے بیچ میں کنہار ہے۔ وادی کی چوڑائی کسی بھی جگہ' پر میرے خیال میں ایک میل سے زیادہ نہ ہوگی۔ کنہار کے پرلی طرف پہاڑی ڈھلانوں پر مکئی اور کھیتوں کے اقلیدسی نمونے تختوں میں اوپر چڑھتے ہیں۔ اور میں ان خوشوں اور بالیوں کو اپنے پسینے سے پروان چڑھانے کے ایک تختے پر پائپ پینے کے لیے جا لیٹا۔ کس قہر آلود نظر سے انقلابی مجھے دیکھ رہا تھا۔؟ مجھے اس کی خاموش آزادگی اور ناخوشی دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ اور ''تھری سنز'' کا ذائقہ مجھے کبھی اتنا اچھا نہیں

لگا۔ مگر اس میں تنی خودداری باقی تھی وہ وہ میرے پاس پائپ کے ایک کش کی درخواست لے کر نہ آیا (مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے پائپ کا تمباکو پسند نہ ہو) وہ مجھے دور سے ایک آزردہ۔ اکیلے بھیڑیئے کی طرح دیکھتا رہا۔ اس نے مجھے بالاکوٹ میں سگرٹ نہ خریدنے پر بڑا کمینہ سمجھا ہوگا۔ اور اس نے اب بھی (میں اس کے چہرے سے بتا سکتا تھا) اس کمینگی کے لیے مجھے معاف نہ کیا تھا۔ میرے پائپ کا دھواں اسے زہر لگا ہوگا۔ گو (جیسا کہ میں نے کہا ہے) انقلابی اپنی خودداری پر استقلال سے قائم رہا۔ ہزارے کے آدمی کے لیے پائپ کا بل کھاتا ہوا پر امن دھواں بہت زیادہ خود شکن ثابت ہوا۔ اس کے قوت ارادی (اگر کہیں تھی تو) بیٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے نزدیک آنے لگا۔ پھر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے لیے بھی ایک پائپ بھر دوں۔ یہ میں نے خوشی سے کیا۔ کیونکہ اس کے آگے پیچھے کے علم کے بغیر وہ کافی پسندیدہ آدمی تھا اور میرے ایس ڈی او ہونے کی دریافت کے بعد تو میرے متعلق اس کے رویے میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ اور وہ میرا طفیلی بن چکا تھا۔

کوئی گیارہ بجے دوسری طرف سے جیپیں آ گئیں۔ اور ہم فوراً ہی روانہ ہو پڑے۔ کنہار اب ایک مقابلتاً پرسکون دریا۔ سڑک کے تقریباً ہموار آ کر سبزہ زاروں میں بہنے لگا تھا۔ پھر ہم نے سامنے ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر برف دمکتی دیکھی۔ برف کا پہلا منظر روح افروز بھی ہوتا ہے۔ اور کچھ لرزہ انگیز بھی۔ انسان قدرت کے حسن اور ہیبت دونوں سے آشنا ہو جاتا ہے۔ برف کو دیکھ کر انقلابی اور خانچی بہت پریشان ہوئے وہ عبداللہ خان سے بار بار پوچھتے کہ ناران کے پاس کے پہاڑوں پر برف تو نہیں ہوتی۔ عبداللہ خان شریف آدمی تھا۔ حسین جان کی طرح چھٹا ہوا نہیں تھا۔ اس نے اس کو اطمینان دلایا کہ ناران میں برف نہیں ہوگی۔ اس کے باوجود انقلابی کی تسلی نہ ہوئی تھی اور اس نے خزانچی کی معرفت ہمیں ٹٹولا کہ کاغان سے آگے نہ جائیں تو بہتر ہے۔ ڈمبل اور میں نے اس کی تجویز پر کان نہ دھرے۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم کاغان کے نام کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ (بالاکوٹ سے کوئی پچیس میل) کاغان وادی کا بڑا قصبہ ہے۔ یہاں سڑک پر مینار کی چار پانچ دوکانیں ہیں۔ ایک آدھ غریبانہ چھوٹا ہوٹل ہے۔ سڑک کے بائیں طرف کھیتوں کے پیچھے کنہار ہے۔ اور اونچے جنگلوں سے پٹے ہوئے پہاڑ اپنے مغرور سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ دائیں طرف پہاڑ پر اونچے نوبروں اور چیلوں میں گھرا ہوا کاغان کا رومینٹک پہاڑی گاؤں ہے۔ اس کو جانے والا راستہ نوکیلے بڑے بڑے پتھروں کے ایک میدان میں سے گزرتا ہے۔ اکا دکا چٹانوں پر لکڑی کی ڈھلانی چھتوں اور کھلے برآمدوں والے رنگین مکان ہیں۔ ہزاروی نے کاسہ لیسوں کی مثالی خوشی سے ہمیں بتایا کہ یہ سیدوں کے بنگلے ہیں۔ اس نے ہم سے وعدہ لیا کہ واپسی پر ہم ایک رات کے لیے اس کے سید دوست کے

ہاں شب باش ہوں گے۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ ایک نہایت ہی مہمان نواز اور نیک آدمی ہے۔ اس نے دور سے ہیں اس سید کا بنگلہ بھی دکھایا۔ کاغان میں ہمارا آدھ گھنٹے کا قیام اس لیے تاریخی ہے۔ کہ انقلابی نے یہاں ایک دوکان سے قینچی کا ایک پیکٹ خریدا۔ میں نے ہزاروی کو اس کی طرف اس امید میں تمتمائی نگاہیں ڈالتے دیکھا۔ کہ انقلابی اپنے پیکٹ میں سے اسے بھی ایک سگرٹ پلائے گا۔ لیکن انقلابی اس معاملے میں پکا تھا۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ اسے میں یا ہزاروی کوئی سگرٹ نہیں پلائیں گے۔ کیونکہ میرے پاس پینے کے لیے اپنا پائپ تھا۔ سیانا ہوشیار انقلابی!

کاغان سے ناران تک پندرہ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ مقابلتاً سیدھی اور ہموار ڈرائیو رہے۔ ناران سے کچھ ادھر کنہار اپنے شاداب کناروں کے درمیان چوڑا ہو گیا۔ اور اوپر سے ایک مقام مجھے یاد ہے۔ دریا یہاں دوناپو بناتا تھا۔ ایک مقابلتاً بڑا اور دونوں ایک آبنائے سے ملے ہوئے۔ سہ پہر کا زرد سونا ان کے پانیوں میں گھل رہا تھا۔ اس مقام پر وادی کے جمال کی یکسانیت دفعتاً تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے حسن میں ایک وسعت سی ایک نرمی سی آجاتی ہے۔ یہاں وادی اپنی آغوش کو ایک فراخ مسکراہٹ کے ساتھ کھول دیتی ہے۔ آیا یہ منظر میں یک لخت تبدیلی کا چونکا دینے۔ خوشگوار تاثر تھا یا یہ کہ میں جھیلوں کو پہاڑوں سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ مجھے یہ منظر بے حد دلفریب لگا۔ یہ کشمیر کے بعض حصوں کی یاد دلاتا تھا۔ اور اب اگر پھر کبھی میں وادی میں سر پر گیا تو میں صرف اسی منظر کو دیکھنے کے لیے وہاں جاؤں گا۔ (مجھے ڈر ہے کہ وقت اور موڈ کا اس سے اکثر تعلق تھا اور میں سایدا سے پھر وہاں نہ دیکھ سکوں)

کوئی چار بجے ہم ناران میں داخل ہوئے۔ جس سے گے جیپیں نہیں جاتیں۔

انقلابی اور ہزاروی جھگڑتے ہیں

ہم ڈاک بنگلے کے پاس سے گزرے (پتھر کی باڑھ کے پیچھے ایک ستھری عمارت!) ہم نے عبداللہ خاں کو یہاں جیپ روکنے کے لیے کہا اور لیڈر اور ڈمبل اندر پتہ کرنے کے لیے گئے کہ آیا ہمیں وہاں ٹھرنے کے لیے کمرے مل سکتے ہیں۔ وہ مایوس لوٹے' وہاں فرنٹیئر پولیس کا کوئی بڑا افسر دورے پر اترا ہوا تھا۔ عبداللہ خان نے بڑی ڈھارس بندھائی ہم آپ کو ہوٹ میں لے چلے گا۔'' وہاں آپ یہاں سے بہت مزے میں ٹھیرے گا''

اب سڑک نے موٹر کی سڑک ہونے کے سوانگ کو اتار دیا اور کھلم کھلا ایک غیر ہموار' پتھریلی چوڑی پگڈنڈی بن گئی تھی۔ یہ ناران کے بازار اور گاؤں میں (دو الگ نہیں ہیں) بھٹکتی ہوئی چڑھتی ہے۔ پھر دو تین چھوٹی دوکانیں' پتھر کے چند کوٹھے اور پتھر کی چنی ہوئی باڑیں جن کے پیچھے مکئی کے کھیت دریا کے کنارے تک جاتے ہیں۔ یہی کل ناران کا گاؤں ہے۔ گاؤں قدرے نشیب میں ہے اور

اس کے پس منظر میں اونچی سبز پہاڑیوں کا ایک وسیع تھیٹر ہے۔ سڑک (اگر یہ سڑک ہی ہے) گاؤں سے نکل کر ایک فرلانگ کے فاصلے پر دریا کو لکڑی کے ایک چھوٹے سے پل سے عبور کرتی ہے (دریا اس جگہ ایک پہاڑی جھرنا ہے) پھر یہ آگے ایک بھورے ماہی پشت چٹانی درے پر سوار ہو جاتی ہے اور اس کے بعد تم اسے نہیں دیکھتے' کیونکہ یہ بھوری چٹانیں وادی کاغان کی یا کم از کم وادی کے اس حصے کی شمالی فصیل ہیں ور وادی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ سڑک اس درے سے آگے کہاں جاتی ہے؟ یہ باٹا کونڈی جاتی ہے۔ اور تیس میل آگے بوبوسر پاس جاتی ہے' اور یہ کئی جادو کے ناموں والی جگہوں میں سے گزرتی ہے جن کے بارے میں سوچنے ہی سے آدمی کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اے میرے قاری! یقینا یقینا کسی دن تم اور میں اسی طرح اکٹھے اس سڑک پر باٹا کونڈی جائیں گے۔ کیونکہ ایک ایسے نام والی جگہ کو دیکھے بغیر آدمی زندہ ہی کیسے رہ سکتا ہے؟

ہم ناران کے واحد ہوٹل کے سامنے جا کر رکے...... لینڈ لارڈ (سرائے دار) نے اپنے تھیلوں اور اسباب کے ساتھ ہمیں اندر داخل ہونے پر اپنی چائے دانیوں' دیگچیوں اور کڑھائیوں کے پیچھے سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ایک مختصر سا دبلا آدمی تھا اور اس کی آنکھوں میں دق کے مریض کی سی غیر قدرتی چمک تھی۔ اس کے انداز میں ایسی مسکینی اور لہجے میں ایسی ریشمی ملائمت تھی۔ جو اس وادی کے دس آدمیوں میں سے نو میں ضرور پائی جاتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ ان ے مورثوں کے وقتوں کا کوئی نامعلوم خوف اب بھی ان کے خون میں رچا ہوا ہے۔ کسی سبب سے یہ چیز نہ صرف وادی کے لوگوں کے کراہی کی خصوصیت ہے بلکہ ہزارے کے بیشتر لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ آدمی وادی کا بندہ نہ تھا' وہ دراصل ہزارے کا رہنے والا تھا اور گرما کے ٹورسٹوں کی آمد کے ایام میں یہاں اس ہوٹل کو چلانے آتا تھا۔ یہ معلومات ہمیں ہزاروی نے بہم پہنچائیں۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی صاحب خانہ کے شانے پر ایک دوستانہ ہاتھ رکھا اور "سناگرائیاں کی حال چال اے۔" سے اس کی اس گرم جوشی سے مزاج پرسی کی جیسے وہ مدت کے بچھڑے ہوئے دوست ہوں۔ ہم بے حد متاثر ہوئے۔ ہزاروی واقعی کارآمد آدمی تھا! سرائے دار سے اس کی یقینا پرانی جان پہچان تھی اور وہ ایک ہی گاؤں کے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سرائے دار اپنے قرابتی اور "گرائیں" کی خاطرداری کے لیے ہماری پوری خدمت کرے گا اور مسافر نوازی میں ذرا بھی کسر نہ اٹھا رکھے گا اور واجبی دام لے گا۔ یہ ہزاروی کیسا کام کا آدمی تھا۔ یہ ہماری خوش بختی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ ناران تک چلا آیا تھا۔ ہمارا لیڈر اب پوری طرح مہم کا لیڈر بن گیا۔ اس نے سرائے دار سے پشتو میں گفت و شنید کی' جسے بعد میں س نے ہمارے فائدے کے لیے ترجمہ کر کے ہمیں سنایا۔ وہ اس آدمی کو اچھی طرح جانتا ہے لیڈر نے کہا' وہ ایک ہی گاؤں' بلکہ ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہیں اور اب قریبا دس سال کے بعد ملے ہیں۔ بڑا شریف آدمی ہے' وہ تو اس کے دوست

ہونے کی وجہ سے ہماری مفت مہمان نوازی پر اصرار کر رہا تھا لیکن اس نے سرائے دار سے کہہ دیا تھا کہ یہ نہیں ہوگا اور یہ کہ ہم ہر شے کے پیسے دیں گے۔''ہم خواہ مخواہ غریب آدمی پر بوجھ کیوں بنیں۔''لیڈر نے عالی ظرفی سے کہا اور ہم سب نے اس سے اتفاق کیا۔

اب ہوٹل کی سنو! یہ انسانی دماغ کی قینا عجیب ترین' ناممکن ترین اختراع تھا' یہ پہاڑ کے اندر ایک لمبا غار تھا...... آدھا غار اور آدھا پتھر اور گارا اور (میرا خیال ہے) اول اول اسے قزاقوں کے بسیرے کے طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے یقینا یہ بے حد موزوں اور قابل تعریف تھا لیکن ایک ہوٹل کی حیثیت سے مگر اس برے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے! پرلی دیوار ایک بڑی چٹان کی ڈھلان تھی...... شہتیروں کی لمبی نیچی چھت لکڑی کے بے شمار پایوں پر سوار تھی۔ چھت ڈھلوان تھی...... داخلے پر کافی اونچی اور چٹان کے پاس کافی نیچی کی آدمی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک ہی لمبا کمرہ یا غار تھا...... کوئی پچاس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا۔ باورچی خانہ بھی داخلے کے پاس ہی تھا اور روشن دان نہ ہونے کی وجہ سے چولھوں کے دھوئیں کے نکاس کا کوئی انتظام نہ تھا' ہر وقت اندر دھواں پھیلا رہتا۔ مگر یہ جگہ سرد راتوں کے لیے بری نہ تھی۔ دس پندرہ کے قریب چارپائیاں اس میں بچھی ہوئی تھیں اور اس ہوٹل میں ایک یا بارباشی کی فضا تھی۔

سرائے در انے ہیں بتایا کہ اس نے اس جگہ کو پورے موسم کے لیے تین سو روپیہ کرایہ پر لیا ہے۔ بہت کم ٹورسٹ اس سال آئے تھے۔ پچھلی پارٹی کو یہاں سے گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اگر یہی صورت حال رہی تو وہ بہ مشکل اپنا موسم کا کرایہ ہی کما سکے گا

تاہم سرائے دار چہرے سے زیادہ ناخوش نہ لگتا تھا اور شاید سب ہوٹل والوں کی طرح اپنی مصیبتوں کی خواہ مخواہ تاریک تصویر کھینچ رہا تھا۔

ہم نے چائے جلے ہوئے انڈوں کے ساتھ پی۔ ہوٹل کا واحد حقہ لیڈر کے تقاضے پر تازہ کیا گیا اور مہانوں کی تواضع اور خوشی کے لیے حاضر کیا گیا۔ انقلابی اور ہزاروی بیتابی سے اسے گڑگڑانے لگے۔ انقلابی نے سرائے دار کو رات کے کھانے کے لیے مرغ کا سالن پکانے کی ہدایت کی اور گھر کے خالص ہونے کا یقین کرنے کے لیے کنستر کو سونگھا اور چکھا۔ چکھنے کے بعد اس نے اپنی ماہرانہ رائے دی کہ گھی سو فیصدی خالص ہے۔ پھر ہزاروی نے یہ کہہ کر کہ اس کا گرائیں' اس کے دوستوں کو ناخالص گھی کیسے کھلا سکتا ہے گھی کے خالص پن کا سارا کریڈٹ خود سمیٹ لیا۔

ڈمبل اور میں جھیل سیف الملوک کو جانے کے لیے بے چین تھے۔ عبداللہ خاں نے ہمیں راستے میں بتایا تھا کہ جھیل ناران سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر یہ اس سے کہیں زیادہ فاصلے پر تھی ہم نے سرائے دار سے پوچھا کہ آیا ہم رات ہونے سے پہلے سیف

الملوک سے لوٹ سکیں گے۔ اس کے باہر دن کو دیکھا۔ اس نے ضرور فاصلے کا غلط اندازہ لگایا ہوگا کیونکہ اس نے ہمیں بتایا آپ لوگ بخوبی رات سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ ہم ہوٹل سے باہر آئے تو سورج ابھی وادی کی پہاڑیوں کی چوٹیوں کو چھو رہا تھا۔ ابھی اس کے غروب ہونے میں تین گھنٹے باقی تھے دن عنبر و گلاب تھا' ہم پتھریلی کھردری سڑک پر چلتے رہے۔ (وہ سڑک جو باٹا کونڈی جاتی ہے ...... آدمی باٹا کونڈی کے نام کو دو سو دفعہ دوہرا سکتا ہے اور ہر بار ایک سحری مسرت کے ساتھ بے شک ایک ہوشربا کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ جو باٹا کونڈی سے شروع ہو' باٹا کونڈی پر ختم ہو اور درمیان میں باٹا کونڈی کو تکرار کے سوا ایک لفظ اور نہ ہو اور میں شرط بدنے کو تیار ہوں کو پڑھنے والے کا دل اس کتاب سے نہ تھکے گا) ہاں اسی بے مثل سڑک پر چلتے ہوئے ہم لکڑی کے ایک پل پر آئے۔ جہاں سڑک پچاس میل تک ندی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کے عد سے آخری بار پار کرتی ہے...... سیف الملوک کو راستہ اسی مرغوب ندی کے ساتھ ساتھ "وحشی" پہاڑوں پر سے جاتا ہے۔ جب ہم ندی کے پرلے کنارے کی پہلی پہاڑی پر چڑھنے لگے جو انتہائی ڈھلوان تھی تو انقلابی اور خزانچی کی ہمت جواب دے گئی۔ خزانچی کا سانس تو دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ ان دونوں نے شاید پہلے کسی پہاڑ پر چڑھائی نہیں کی تھی۔ انہیں سیف الملوک جانے کا مطلقاً شوق نہ تھا۔ وہ مجبوراً ہمارے ساتھ آ رہے تھے کیونکہ ڈمبل اور میں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر کوئی اور ہمارے ساتھ چلنے پر تیار نہ بھی ہوا تو بھی ہم دونوں سیف الملوک ضرور جائیں گے۔ ناران تک آنا اور سیف الملوک کو دیکھے بغیر لوٹ جانا یہ ایسی ہی بات تھی کہ آدمی بہشت میں جائے اور وہ درخت نہ دیکھے جس کا پھل آدم نے توڑا تھا۔ سیف الملوک کو نہ دیکھنا گویا صریحی زندیقی کا کام تھا...... ہم اس پہاڑے پر تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہمیں کلہاڑے والا ایک آدمی جو اوپر سے لکڑیاں کاٹ کر لا رہا تھا۔ آتا ہوا ملا۔ ڈمبل نے اس سے سیف الملوک کا راستہ پوچھا۔

"یہی راستہ ہے" اس نے کہا "مگر یہ سیف الملوک کو جانے کا کونسا وقت ہے۔ آدھے راستے تک تو تمہیں رات ہو جائے گی۔"

ہم اتنی جلدی اپنے ارادے سے ہٹنے والے نہ تھے' انقلابی اور خزانچی فوراً واپس جانے کو تیار ہو گئے۔ ڈمبل خچر جیسی مضبوط ٹانگوں اور غیر متزلزل دل کا لڑکا ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی اور جائے یا نہ جائے وہ تو ضرور جائے گا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ جانے کا عزم ظاہر کیا اور ہم پہاڑ پر چڑھنے لگے کلہاڑی والا آدمی ہمارے پیچھے آیا۔ وہ ہمیں جانے دینے کو تیار نہ تھا "مت جاؤ" اس نے کہا "راستہ خطرناک ہے۔ تم وہاں نہیں پہنچ سکتے" اس آدمی کے لہجے میں اتنی سنجیدگی تھی اور راستے کے خطرے کا اشارہ اس کہ ہم نے بڑی ہچکچاہٹ سے لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آدمی یقیناً کوئی فرشتہ تھا۔ کیونکہ اگر ہم چلے جاتے تو میں اس خیال ہی سے کانپتا ہوں کہ کیا ہوتا۔ ہم شاید برفوں پر سردی میں ہلاک ہو جاتے لیکن پھر بھی میں کبھی کبھی خواہش کرتا ہوں کہ کاش وہ آدمی ہمیں نہ ملتا اور ہم اس وقت چلے

جاتے اور ہم موت کو قریب سے ایک پہاڑ پر کھڑے دیکھتے اور اگر سلامتی سے بچ کر آتے تو ہم ایک ہولناک ساکھا کے کردار بن جاتے جو شاید رائڈر ہیگرڈ کے سنسنی خیز صفحوں میں ہی مل سکتے ہیں۔

ہم واپس ہوئے تو اس ٹوکنے والے آدمی سے قدرے خفا تھے۔ سیف الملوک کو کل کے لیے چھوڑ کر ہم نے اپنے ہوٹل کے پیچھے کے بڑے پہاڑ پر چڑھائی شروع کر دی۔ یہ پہاڑ چیل' دیودار اور صنوبر کے گھنے درختوں سے پٹا ہوا تھا' اس پر محکمہ جنگلات کی بنی ہوئی پگڈنڈیاں تھیں اور بھڑکیلے رنگوں کے جنگلی پھول افراط سے کھلے تھے۔ کچھ کچھ لارنس گارڈن (باغ جناح) کی سکندر مونٹ (اگر انہوں نے اس کا نام تبدیل نہیں کر دیا) کی پیچدار اور آڑی روشوں کا خیال آتا تھا' مگر قدرت کی اس وسیع تماشا گاہ میں ایک ہزار سکندر مونٹس سما سکتی تھیں۔ کسی انسانی ہاتھ نے اس کے پھولوں کی آبیاری نہ کی تھی۔ نہ اس کے لاتعداد پودوں کو سینچا تھا۔ ہم چڑھتے گئے اور ایک گھنٹے کی سخت چڑھائی کے بعد چوٹی پر پہنچے۔ یا ایک ایسے مقام پر جو چوٹی کے قریب تھا۔ اس پہاڑ کی چوٹی ہیولی تھی۔ وہاں لہروں کی طرح ہلکورے لیتی ہوئی حسین چراگاہیں تھیں۔ ہم یہاں ایک ننھے چرواہے سے ملے۔ اس کے گالوں میں گلاب تھے اور وہ اتنا خوش ادا تھا جتنا تمہارا کوئی تعلیم یافتہ لڑکا۔ ہزاروی نے اس سے کہا وہ ہمیں کچھ پلا سکتا ہے۔ لڑکا ہمیں اپنے کنبے کی جھونپڑی میں لے گیا جو گھاس پھونس کا گول کنٹوپ نما گھر تھا۔ ہم نیچے فرش پر ایک دائرے میں بیٹھ گئے۔ لڑکا مٹی کے ایک ڈول میں بکری کا تازہ دودھ دودھ لایا اور اس ڈول کو ہم نے باری باری منہ سے لگایا۔ پھر لڑکا اپنی بہن کو گود میں اٹھا لایا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارا خزانچی بچی کے ہاتھ میں کچھ دینے پر مطلق غور نہیں کر رہا ہے۔ آخر میں نے دو روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ یہ ان غریب لوگوں کی مسافر نوازی اور تازہ صحتمند دودھ کا حقیر معاوضہ تھا گو ڈمبل اور ہر ایک نے احتجاج کیا کہ یہ بہت زیادہ تھا۔ بہت زیادہ جیسے مرغزار و پر ان مفلوک الحال چراہوں کے دودھ کی کوئی قیمت ہو سکتی ہو!

لیکن شام پڑنے لگی تھی۔ ہم نے اس اچھے پہاڑ سے اترنا شروع کر دیا۔ اپنے جوش میں اور چوٹی پر پہنچنے کی خواہش میں (کیونکہ کسی پہاڑ پر چڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک تم اس کی چوٹی تک نہ پہنچو) ہم کافی دور اوپر آ گئے تھے اترائی جادو کی طرح آسان تھی اور ہم پگڈنڈیوں پر بھاگتے اور چوکڑیاں بھرتے گئے۔ خزانچی نے ایک ڈھلانی پگڈنڈی پر غیر ارادتاً گلیل سی کی تو پھولوں کے ایک تختے پر جا گرا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا لیکن اس کے زیادہ چوٹ نہ آئی۔ ہوٹ میں پہنچے تو شام گہری ہو گئی تھی' کچھ دیر ہم ہوٹل کے باہر ایک ایک جھونپڑی کی چھت پر چارپائیوں پر بیٹھے مغرب میں آسمان کو آگ ہوتے دیکھتے رہے ...... تام چینی کی پیالیوں میں چائے پیتے رہے اور حقہ گڑگڑاتے رہے' اور انقلابی اور انقلابی دونوں کو دیا د کرتا رہا۔ سردی بڑھی تو ہم ہوٹل کے اندر آ گئے۔ دو ڈرائیور

...... عبداللہ خاں اور ہمارا پر مذاق دوست حسین جان وہاں کھانا کھا رہے تھے (انہیں رات کو وہیں سونا تھا) ہمارے کھانا کھاتے ناران کے سب مقامی معززین ہوٹل میں ٹورسٹوں کو دیکھنے اور ان سے تبادلہ خیالات کرنے وہاں آموجود ہوئے۔ ایسی دور افتادہ جگہوں میں جہاں اخبار تک نہیں آتا ایک چائے خانہ یا ہوٹل ہی شام کو لوگوں کو چوپال کا کام دیتا ہے۔ ٹورسٹ پورے ایک ہفتے کے بعد یہاں آئے تھے اور یہ گاؤں کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ ان معززین میں سے ایک لمبا چوہوں جیسی مونچھوں والا شخص تھا ...... جرسی اور نیکر پہنے۔ وہ ایک اونچی جھگڑالو آواز میں باتیں کرتا تھا اس نے ہمیں بتایا کہ وہ کسی زمانے میں فوج میں حوالدار تھا اور اب یہاں پر ٹراؤٹ مچھلی پکڑنے والوں کے لائسنس چیک کرنے پر لگا ہوا ہے۔ وہ اس انداز سے باتیں کرتا تھا جیسے وہ ایک بڑے عہدے پر متمکن ہو اور جیسے کہار کی ساری ندی بمعہ ٹراؤٹ مچھلیوں کے اس کی ذاتی جاگیر ہو۔ اس میں حکومت کے ایک چھوٹے پرزے کی پوری نخوت اور ڈینگ موجود تھی۔ یہ آدمی ایک ناقابل برداشت "بور" تھا اور اس کے نزدیک انسان صرف دو قسم کے تھے ...... وہ جو ٹراؤٹ مچھلیاں پکڑتے تھے اور وہ جو ٹراؤٹ مچھلیاں نہیں پکڑتے تھے ...... یعنی ہم سے عام ایرے غیرے آدمی۔ دوسرے معززین چار پانچ مقامی تاجر وغیرہ تھے۔

پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ حوالدار نے ٹراؤٹ فشنگ پر روشنی ڈالی کہ ہر سال بڑے صاحب لوگ مچھلی پکڑنے آتے ہیں۔ موسم اور کئی ایک اور چیزوں کا ذکر ہوا۔ ہزاروی کی موجودگی میں ناممکن تھا کہ گفتگو زیادہ دیر تک سیدوں کے موضوع سے دور رہے۔ اس نے اور حوالدار نے (جو سب چھٹے اہلکاروں کی طرح امیروں اور طاقتوروں کے مداحوں میں سے تھا) سیدوں کے مکانوں' موٹروں اور املاک کے راگ الاپنے شروع کر دیئے۔ انقلابی اپنی انقلابی لہر میں ٹ ھا۔ وہ سیدوں کی تعریف پر چمک اٹھا۔ اس نے فی الواقعی خطابت اور فصاحت کے دریا بہا دیئے۔ اسے اسلامی تواریخ اور حدیث وفقہ کے بعض مناسب ارکان سے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ وہ اپنی تقریری میں امام غزالی اور بوعلی سینا کو لایا۔ اس نے امام ابو حنیفہ کا حوالہ دیا۔ اس کے سامعین اس کے علم سے بے حد متاثر اور مرعوب ہوئے۔ انقلابی جوش میں ذرا حد سے تجاوز کر گیا۔ اس کے منہ سے ایسے کلمات نکل گئے۔ جو ہزاروی اور حوالدار کو برے لگے اور انہوں نے لال پیلے ہو کر انقلابی سے تلواریں بھڑا لیں۔ میرا خیال ہے۔ نوبت ہاتھ پائی پر آجاتی کہ حسین جان نے چند چٹکلوں سے ان کا بیچ بچاؤ کر دیا۔ اس کے بعد انقلابی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس نے چپ سادھ لی اور اندر ہی اندر بھنّاتا رہا' وہ شاید سوچ رہا تھا کہ یہ اجڈ اور اکھڑ لوگ ذہنی طور پر اس کی مدلل گفتگو کو سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔

یہ محفل اس طرح تلخی اور برہمی میں برخاست ہو گئی۔ حوالدار نے جاتے ہوئے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ علی الصبح اپنے لڑکے کو بھیج

دے گا۔ جو ہمیں سیف الملوک پر لے جائے گا۔ اس کو روپیہ دو روپیہ دے دینا اس کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ اس نے کہا مجھے شک ہے کہ حوالدار کے آنے کا اصل مقصد ہی یہ تھا۔

ہم تھوڑی دیر اور جاگے اور پھر پسوؤں سے بھرے ہوئے لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے۔ آدھی رات کو مجھے سردی لگی...... سرائے دار ابھی تک بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ اس اچھے آدمی نے ایک اور لحاف میرے اوپر ڈال دیا۔ اس کے باوجود میں ٹھٹھرتا رہا اور اس عجیب کوٹھے میں سردی اور پسوؤں کی وجہ سے ساری رات جاگتا رہا...... اور ناران کو کوستا رہا۔

یاقوت کی جھیل

دوسری صلہ ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ ہمارا چھوٹا گائیڈ آ گیا۔ وہ کوئی تیرہ چودہ کے سن کا چمکیلا خوبرو لڑکا تھا...... دنیا کے ہر فکر و غم سے آزاد۔ اگر واقعی ٹراؤٹ مچھلی کے حوالدار کا لڑکا تھا تو کسی ماہر نسلیات سے پوچھنا پڑے گا کہ ایسے پست اور بے ہودہ شخص نے اس یوسف ثانی کو کیسے پیدا کر لیا' مگر مجھے شک ہے کہ وہ حوالدار کا لڑکا نہیں بلکہ بھتیجا یا بھانجا وغیرہ تھا۔ اس نے مہم کے افراد پر خفیف حقارت آمیز نگاہ ڈالی' وہ بہتر آدمیوں کا گائیڈ بننے کا اہل تھا نہ کہ شہری بزدل بابوؤں کا! انقلابی نے لڑکے سے سیف الملوک کے راستے کے متعلق الٹے سیدھے سوالات کرنے شروع کر دیئے...... زیادہ چڑھائی تو نہیں؟ ریچھ اور چیتے وغیرہ تو ضرور ہوتے ہوں گے؟ برفیلے پہاڑ تو راہ میں نہیں آئیں گے؟ ہمیں شرم آنے لگی کہ لڑکا کیا سوچتا ہوگا؟ قدرے حقارت سے مسکراتے ہوئے لڑکے نے انقلابی کے سوالوں کا جواب دیا۔ انقلابی کا ہراس اور اضطراب واقعی مضحکہ خیز تھا اور جب اسے کچھ کچھ اطمینان ہو گیا کہ اس کے زندہ واپس آنے کا خاصا امکان ہے تو وہ چاروناچار چلنے پر تیار ہو گیا۔

ہم باہر نکلے تو سڑک اور وادی پر کہرا اترا ہوا تھا لیکن جب ہم کنہار کو پل سے عبور کر کے پچھلے روز کی پہاڑی پر چڑھے تو کہرا اٹھانا شروع ہو گیا تھا' سورج پہاڑ کی چوٹیوں پر زرکاری کر رہا تھا اور درختوں میں پرندے نئے دن کی کوشی میں چہچہا رہے تھے۔

کچھ دیر ہم نے دیودار اور چیل کے جنگل میں سے ایک ناہموار پگڈنڈی کا پیچھا کیا (ہمارے دائیں کو دریا کے پار وہ سبز پوش بڑی پہاڑی جس پر ہم پچھلی شام کو چڑھے تھے اور نیچے جنگلی پھولوں سے لدے کناروں کے درمیان اچھلتی ٹمٹماتی ندی!) پھر پگڈنڈی پہاڑی پر سے نیچے اتر آئی اور ہم گھاٹی میں پتھروں کے اوپر ندی کے ساتھ ساتھ دیر تک چلتے رہے۔ ندی کا راگ ہمارے کانوں میں گھل رہا تھا۔ ہم ایک منتشر پارٹی تھے۔ ڈمبل اور گائیڈ سب سے آگے تھے۔ ان سے کچھ پیچھے ہزاروی اور میں آ رہے تھے اور ہم سے کافی پیچھے انقلابی اور خزانچی ناخوش اور رنجیدہ لڑھکتے ہوئے آ رہے تھے۔ پچھلی رات کے جھگڑے سے انقلابی اور ہزاروی ایک

دوسرے سے کھنچ گئے تھے ہزاروی نے اب مستقل طور پر مجھ سے ناتا جوڑ لیا تھا...... ایک تو شاید میرے ایس ڈی او ہونے کی وجہ سے' مگر زیادہ تر اس لیے (یہ میرا قیاس ہے؟) کہ میں ایک پائپ کا مالک تھا!

سنگریزوں اور پھولوں کے بیچ گنگناتی ہوئی ندی کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوچا کہ شاید ایسی ہی جگہ کے پاس دمی سچی خوشی پا سکتا ہے مجھے دریاؤں سے محبت ہے۔ میرے خیال میں ایک اچھی عورت کے بعد ایک دریا زندگی کی سب سے دلپذیر شے ہے۔ چمکیلا دن' عمدہ تمباکو اور سٹیونسن ...... کون ان کے مسرت بخش اثر سے بچ سکتا ہے مگر میں ان سب کو دریا کے بعد رکھوں گا۔ ان سے پوری پوری لذت حاصل کرنے کے لیے بھی دریا کا کنارہ ضروری ہے اور اس شخص سے زیادہ کون خوش قسمت ہے جو دریا کنارے اپنی پسند کی عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ میں اپنے دریا کو ست اور تنہا ریتلے کناروں کے درمیان پڑے ہوئے زیادہ پسند کرتا ہوں' اور اگر دریا میں کھڑیاں اور آبنائیں ہوں۔ اگر اس میں روح افروز پیچ اور موڑ ہوں اور کناروں پر اکا دکا کھجور کے پیڑ تو پھر میری خوشی مکمل ہے۔ ایسا دریا میرا محبوب ستلج ہے۔ دنیا میں کوئی اور دریا ستلج سے زیادہ خوبصورت نہیں۔ سو اس ندی کے کنارے میں اپنے پائپ کے کش لگاتا ہوا اتنا خوش تھا جتنا خوش ہونا آدمی کے لیے ممکن ہے (دریا پر تمباکو پینا ایک متبرک ریت ہے۔ اور تمباکو تمہیں ایک آسمانی لذت دیتا ہے) کیونکہ اپنے لطف میں دوسرے کو شریک کرنا اس لطف کو دس گنا بڑھا دیتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اپنے علاقے کے سیدوں سے اس درجہ مرعوب تھا' ہزاروی اچھا خاصا ہم صحبت تھا۔ لمبی سڑک پر کھلی فضا میں ہم اپنے ساتھیوں میں بڑھی ہوئی ذہنی جدت یا بے عیب شرافت کردار کے متلاشی نہیں ہوتے۔ یہ چیزیں شاید ڈرائنگ روم میں کچھ قیمت رکھتی ہوں گی مگر کھلی سڑک کے اخلاق اور اصول بالکل اور ہیں۔ بے شک ایک آدمی کا آگا پیچھا نہ ہو۔ بے شک اس کی آنکھ تمہاری گھڑی یا فونٹن پین میں سے نہ ہٹے اور وہ جعل ساز اور گرہ کٹ ہو تم ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے اور اگر وہ دلچسپی سے چیزوں اور آدمیوں کے بارے میں اپنی زبان چلا سکتا ہے اور پہاڑ پر بڑبڑائے بغیر چڑھ سکتا ہے تو وہ تمہارے لیے اچھا ہم سفر ہے...... ہزاروی یقیناً ایک خوشگوار بکی تھا...... اور میرا خیال ہے وہ دل کا زیادہ برا نہیں تھا۔ وہ انقلابی سے یقیناً بہتر آدمی تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی انتھک مارچ ہمیں ایک اور جنگل اور سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑے پر لائی یہاں ہم تھوڑی دیر ستائے' ہم کافی تھک گئے تھے اور خزانچی کا تو برا حال تھا۔ وہ دھونکنی کی طرح ہانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں تھکن کے آنسو تھے۔ اسی پہاڑی پر ہم نے ایک بوڑھے آدمی کو اپنی عورت اور بچے کے ساتھ نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ آدمی نے اپنے ہاتھ میں ایک خچر کی باگ پکڑ رکھی تھی جس کی پیٹھ پر کنبے کا سامان لدا تھا ہمارے پوچھنے پر آدمی نے ہمیں بتایا کہ گھر کا واحد بچہ کسی مہلک آزار میں مبتلا ہے اور وہ اسے

نیچے ڈاکٹر کو دکھانے جا رہے ہیں۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہمیں علم ہے کہ آج ڈاکٹر ناران میں ہے (ساری وادی میں ایک ہی ڈاکٹر ہے جو ہفتے میں ایک دن کے لیے ناران میں آتا ہے) ہمیں پتہ نہ تھا۔ ان لوگوں کے چہروں پر مکمل بے بسی اور افلاس تھا۔ آدمی کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان کو ہمدردانہ الفاظ سے زیادہ کچھ اور بھی دے سکے۔ ایک تھکا دینے والا بے سود سفر ان کے آگے تھا۔ بچہ ......ان کا اکلوتا بچہ مر رہا تھا...... اور ڈاکٹر ناران میں ہفتے میں صرف ایک روز کے لیے آتا ہے...... انقلابی نے بچے پر کوئی دم درود پھونکا جس سے بوڑھے والدین کو کچھ تقویت پہنچی اور وہ اسے دعائیں دیتے ہوئے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ہمارا ننھا گائیڈ ہرن کی طرح سبک اور لطیف تھا۔ تھکان اسے چھو تک نہ گئی تھی اور وہ ہماری حالت پر مسکراتا تھا۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ اب جھیل کتنی دور ہے اس نے کہا کہ ہم آدھے راستے سے زیادہ نہیں آئے...... آدھا راستہ! ہم ایک عمر چلتے رہے تھے اور ابھی تک ہم نے آدھا ہی راستہ طے کیا تھا۔ اس خبر سے خزانچی اور انقلابی کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ خزانچی نے (جو چاروں شانے چت سبزے پر نڈھال لیٹا ہوا تھا) کراہتے ہوئے ہماری منت کی کہ ہم اس کو وہیں چھوڑ دیں اور واپسی میں اسے ساتھ لے لیں۔ ڈمبل اور ہزاروی نے اس کی ٹانگوں کو دابا اور سہلایا اور ہماری حوصلہ بندھانے پر کہ اب جھیل دور نہیں ہے وہ چلنے پر راضی ہو گیا۔

اس پہاڑی سے ہم ایک برفیلی ڈھلان پر آئے اس منظر نے ہمیں خوشی سے پاگل کر دیا۔ (خزانچی اور انقلابی کے دل ڈوب گئے۔ برف سفید چادر کی طرح پہاڑ کے چہرے پر پڑی تھی۔ اور نیچے ندی کے تقریباً کنارے تک جاتی تھی۔ سورج اس میں منعکس ہو کر ایک عجیب منشوری بلور کا تاثر دیتا تھا اور آنکھوں کو چندھیاتا تھا۔ اس برفیلے خطے کو پار کرنا کوئی آسان نہ تھا ہمارے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ ایک بار میں پھسلنے لگا تو میں نے ہزاروی کو سہارے کے لیے پکڑنے کی کوشش کی۔ اس سے ہزاروی بھی نیچے آ رہا اور ہم اکٹھے تھوڑی دیر نیچے پھسلتے گئے۔ انقلابی نے عقلمندی کی۔ اس نے اپنے آ کو ایک درخت کی ٹہنی سے لیس کر لیا۔ اور اس کو لاٹھی کے طور پر کام میں لا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک دفعہ بڑا اثر مناک طریق پر گرا اور چونکہ ہم نے اس کے گرنے پر اپنی قدرتی بشاشت کو چھپانے کی ضرورت نہ سمجھی اس لیے اسے بڑا طیش آیا۔ خزانچی نے سارا فاصلہ بیٹھ بیٹھ کر گائیڈ کی مدد سے طے کیا۔ میرے خیال میں وہ کافی پھسلا ہوگا کیونکہ وہ ہم سے کچھ دور نیچے جا کر نکلا۔ برفیلے خطے کے آخر میں ایک نیلا پہاڑی جھرنا تھا۔ اس کو کسی قدر دقت سے پھلانگتے ہوئے ہم ایک اور پہاڑ پر آئے جس پر جنگل خال خال تھے۔ ہمارے گائیڈ نے جو ایک نورانی وجود کے ہلکے قدموں سے چلتا جاتا تھا ہماری ڈھارس بندھائی کہ جھیل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کے یقین دلانے کے باوجود یہ پہاڑ نہ ختم ہونے والا ثابت

ہوا۔ راستہ اس کے اردگرد ایک سانپ کی طرح سکڑتا لپٹتا چلا گیا تھا۔ بعض جگہ یہ راستہ آدمی کے پاؤں کے سہارے سے بھی باغی ہوجاتا اور وہاں سے گزرنے کے لیے چٹانوں کی نوکوں اور کنگروں کو پکڑنا پڑتا۔ ایک خاص غدار جگہ کا تصور کر کے مجھے اب بھی پسینہ چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں راستہ یکلخت ختم ہوجاتا تھا اور تین چار فٹ کے خلا کے بعد یہ پر شروع ہوجاتا تھا۔ خلا نیچے پٹانی کھائیوں سے کوئی پانچ سو فٹ بلندی پر ہوگا۔ پاؤں کی ذرا سی چوک سے آدمی گر کر نیچے چٹانوں پر پاش پاش ہوسکتا تھا۔ ہم سب کے چہرے خوف سے سفید ہوگئے مگر آخرالامر ہم ایک ایک کر کے چٹان کے سوراخوں میں پاؤں رکھتے دوسری طرف پہنچ گئے۔ ہمارا ائیڈ اس خطرے کو ذرا سا بھی خطار میں نہ لایا۔ اس کے نتھنے خفیف تحقیر میں اوپر اٹھے ہوئے تھے۔

اس پیچدار راستے پر چلتے ہوئے ہم پہاڑ کے ایک کونے پر آئے اور یہاں اچانک ہماری نظریں فطرت کے ایک بے مثال نظارے پر پڑیں اور ایک لحہ کے لیے ہمارے سانس رک گئے۔ ہم دم بخود ہو کر اس معجزے کو دیکھنے لگے۔ نیچے جنگلوں سے ڈھپے ہوئے چٹانی نشیبوں اور بلندیوں کے دریان ایک زریں دھند کے میدان میں سیف الملوک جھیل یاقوت کے نگینے کی طرح جڑی ہوئی تھی۔ سفید برف کے تودے اس کی صاف سبز سطح پر تیر رہے تھے۔ ان میں سے چداپنے خاص زاویے کی وجہ سے سورج کی روشنی میں خون سے چھلکا رہے تھے۔ جھیل کے مشرقی کونے کچھ دور ایک پر شکوہ، برف سے سفید پہاڑ اپنا مغرور سر اٹھائے کھڑا تھا، وہ ترشا ہو ابلور تھا اور اسی لیے وہ اسے شیشہ پہاڑی کہتے ہیں۔ اس آسمانی منظر کو دیکھ کر ہماری سب تھکاوٹ گویا جادو کے اثر سے اتر گئی۔

میں نے اپنے ننھے گائیڈ کو تشکر کے جذبے سے دیکھ کر اسے اپنے راز میں شریک کیا "یہ پہاڑی پر برف کیسی ...... کیسی ......" میرے پاس اس پہاڑ کی برفوں کو بیان کرنے کے لیے کوئی لفظ نہ تھا۔

میرا راہنما صحیح لفظ کی تلاش میں میری پریشانی پر مسکرایا، اس نے میری مدد کی اور سادگی سے کہا۔

"کچی برف"

کچی برف! یہ اس برف کو بیان کرنے کے لیے واحد صحیح لفظ تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس کوہستانی لڑکے نے مجھے یہ لفظ دیا تھا، وہ لڑکا جس نے کبھی سکول کا منہ نہ دیکھا ہوگا۔ لڑکے میں ایک پیدائشی شاعر کی روح تھی۔ میرا ایک دوست شاید اس برف کو سحری، برف کہتا اور میں کچھ سوچ کے بعد غالباً اس کے لیے کنواری کا لفظ دریافت کرتا مگر کچی کا لفظ اس برف کو پوری طرح بیان کرتا ہے جو اس پہاڑ کو سرتاپا ایک براق لبادے کی مانند ڈھانپے تھی۔

جب ہم پہاڑ کی اترائیوں میں آئے تو ہم نے ادنی بالاپوش میں ایک آدمی کو...... جو آدمی کے بجائے ایک غلیظ حیوان لگتا تھا

رسہ لینے بھاگتے دیکھا۔

ہزاروی نے کہا ''یہ گوجر ہے! اور اس سے پوچھا'' تمہارے پاس دودھ ہوگا؟

آدمی نے رک کر کہا ''تم دودھ پیے گا؟ اچھا تم نیچے جائے۔ میں ابھی بھینس کو پکڑ کر تمہارے لیے دودھ لاتا ہے۔''

وہ ایک عجیب سی ہندوستانی بولتا تھا جو اردو کی بگڑی ہوئی شکل تھی' یہ گجری زبان تھی۔ اسے تھوڑی سی توجہ دینے سے بخوبی سمجھا جاسکتا تھا۔ ہم نیچے اتر آئے اور چھوٹی چٹانوں کو پھلانگتے جھیل کی سمت چلنے لگے۔ ہمارا گوجر میزابان رسہ لیے چٹانوں اور پہاڑی راستوں پر ناقابل یقین پھرتی سے بھاگتا ہوا جنگلوں کی کوئی بوسیدہ مخلوق لگتا تھا۔

اپنے قرابت داروں کی محبت میں

جھیل سے ایک فرلانگ ادھر ہم اپنے مستقبل کے میزبان کے کنبے کے دیگر افراد سے ملے' وہ وہاں اپنے مویشیوں کے گلے کے درمیان بیٹھے اپنے قرابتیوں اور بھٹکی ہوئی بھینس کا انتظار کر رہے تھے۔ بھیڑ کی کھال کے بالاپوشوں میں وہ تین غلیظ ترین اور خوش ترین انسان تھے جن پر میں نے کبھی آنکھیں ڈالی ہیں...... راکھ جیسی رنگت میلی اور نجس ڈاڑھیاں اور (مجھے یقین ہے) ان کے جسم جوؤں اور کیڑوں سے بھرے ہوئے۔ انہیں نہائے ہوئے غالباً ایک سال ہو چکا تھا۔ ان کی عورتیں کالی شالوں میں اپنے سر اور منہ کو لپیٹے پاس ایک ٹیلے پر بیٹھی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کی رنگت تانبے کی سی تھی' وہ خوبصورت تھیں...... ایک ہی مشترکہ خاندان کی...... ساس' بہویں' جٹھانیاں۔

''السلام علیم'' ہم نے کہا' میرے ساتھی آگے جھیل کی سمت بڑھ گئے اور میں وہاں ان پہاڑے گوجروں سے باتیں کرنے کے لے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ مگر کچھ فاصلے پر کیونکہ ان سے سڑے مکھن کی تیز بو آتی تھی۔ بہرحال میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اس لیے کہ آخر وہ میرے ہم قوم اور قرابت دار تھے۔ اب اس کی کسی قدر تشریح کی ضرورت ہے اور میں اپنے ناز بردار پڑھنے والے سے اپنی خاندانی تاریخ پر روشنی ڈالنے کی اجازت کا خواستگار ہوں۔

میں خود گوجر ہوں اور میرے وطن کے گاؤں کے میراثی ہمارے شجرہ نسب کو پرتھوی راج چوہان سے جاملاتے ہیں۔ وہ تو اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ مگر یہ مسافت بہت لمبی ہے۔ پرتھوری راج چوہان کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ یہ وہی ذات شریف ہیں جنھوں نے ایک سوئمبر میں اپنے حلیف راجہ جے چند کی لڑکی سنجوگتا کو گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا کر بھگا لے جانے سے تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں (مجھے افسوس سے اقرار کرنا پڑتا ہے) ہم چوہانی گوجر اپنے نامور مورث کے سے دلیر اور بہادر نہیں

رہے اور کافی مدت سے ہم میں سے کسی نے کسی لڑکی کو بھگانے کی جرات نہیں کی۔ آہ۔ یہ زمانے شجاعت کا زمانہ نہیں ہے! ہاں دو تین پشت پیچھے شجاعت میرے آبا کی ہڈیوں میں مردہ نہ تھی۔ میرا لکڑ دادا...... کہا جاتا ہے...... اپنے وقت میں مویشیوں کا ایک نامی جور تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے گاؤں کا ایک باعزت شہری بھی۔ وہ بڑی زبردست جسمانی طاقت کا شخص تھا اور کئی بار اس نے چڑھے ہوئے جہلم کو تن تنہا بھینسوں کے گلے کے ساتھ تیر کر پار کیا۔ اس کا نام ایماندار اور پر امن لوگوں کے لیے ایک دہشت تھا۔ میری دادی بابا گوہر کی ایک کہانی سنایا کرتی تھیں۔ بابا گوہر کا ایک سانسیانی (خانہ بدوش عورت) پر دل آ گیا۔ اس نے نکاح پڑھوا کر اسے اپنے گھر میں ڈال لیا۔ سانسیوں کو پتہ لگا تو انہوں نے آ کر بابا گوہر کے گھر کو گھیر لیا اور بابا گوہر کو لڑکی چھوڑ دینے پر اکسانے کے لیے زور زور سے دوہائی دینے لگے!

او ساڈی سوما بلے کھاندی ہو
او ساڈی سوما گیدڑ کھاندی ہو

انہوں نے اور بہت کچھ اس طرز پر کہا۔ ان کا خیال تھا کہ بابا گوہر کو جب معلوم ہوگا کہ سوما (یہ لڑکی کا نام ہے) گیدڑ کھاتی ہے تو ایک دیندار آدمی ہونے کی وجہ سے اسے صدمہ پہنچے گا اور وہ اسے سانسیوں کے حوالے کر دے گا مگر بابا گوہر پر اس اطلاع اور چیخ وکار کا کچھ اثر نہ ہوا' اب سانسی بپھر گئے اور مکان کو آگ لگانے کی دھمکی دینے لگے' اس پر بابا ہوگر آڑے کر دروازے میں کھڑا ہو گیا ...... سہمی ہوئی سوما اور اس کے چلاتے ہوئے غضبناک رشتہ داروں کے درمیان ان اس نے ان کو چیلنج کیا کہ ان میں کوئی مرد ہے تو آ کر سوما کو اس سے لے جائے۔ اس نے سوما سے کہا کہ تو اپنے رشتہ داروں کے پاس جانا چاہتی ہے تو جا سکتی ہے۔ سوما نہ گئی اور اس کے پاس کھڑی رہی۔ سانی یہ دیکھ کر ان کا مدمقابل ان سے زیادہ طاقتور ہے چپ چاپ چلے گئے (بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ ممکن ہے میں نے اپنے "جپسی" (خانہ بدوشوں کے سے) اطوار سوما سے خون میں پائے ہوں گے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سوما ہی میری لکڑ دادی تھی۔ ممکن ہے میری لکڑ دادی کوئی اور عورت ہو۔

میرا پردادا حافظ محمد عالم ایک عجیب تضاد سے جو ان قدیمی خاندانوں میں ندر نہیں ہے اپنے وقت کا ایک مانا ہوا دہقانی عالم تھا وہ ایک پنجابی شاعر بھی تھا اور اس نے قصہ سیف الملوک اور سوہنی مہینوال کو نظم کیا تھا۔ اب تک یہاں میراثیوں کو اس کے بیت ازبر ہیں۔ وہ دور دور تک عیسائی پادریوں سے مناظرے اور مباحثے کرنے جاتا اور چونکہ وہ ذہن کا تیز اور حاضر جواب تھا۔ اکثر ان کو خاموش کر دیتا اور سادہ دہقانی مجمع اس کی دلیلوں پر عش عش کر اٹھتا۔ ایک ایسے ہی مناظر کے قصہ میں نے اپنے دادا سے سنا۔ جہلم میں مسلمان

علماء اور پادریوں کے ایک بڑے مذہبی مناظرے میں ایک بڑبولے پادری نے میرے دادا سے پوچھا ''تم ایمان رکھتے ہو کہ حضرت یسوع آسمان پر اٹھا لیے گئے''...... ''ہاں یہ میرا ایمان ہے'' میرے پردادا نے کہا ''پھر'' پادری نے فاتحانہ کہا ''پھر ہمارا عیسیٰ آسمان پر زندہ اٹھا لیا گیا اور تمہارا محمدؐ زمین میں ہی دفن ہوا۔ اس صورت میں کون بڑا ہوا؟ عیسیٰ یا محمدؐ؟ پادری کے اعتراض پر مجمع میں سناٹا چھا گیا اور سب میرے پردادا کی طرف دیکھنے لگے کہ وہ اس کا کیا جواب دیتا ہے' میرے پردادا نے ٹھنڈے طریق سے کہا ''میں ابھی تم پر ثابت کیے دیتا ہوں کہ کون بڑا اور بھاری ہے۔'' پھر پاس ہی ایک مہاجن کی دوکان سے تکڑی اور مختلف وزنوں کے بٹے منگوائے گئے۔ میرے پردادا نے ایک پلڑے میں پاؤ کا بٹہ ڈالا اور دوسرے میں سیر کا اور ترازو کو ڈنڈی سے اٹھایا ایک سیر کا پلڑا زمین پر ہی رہا اور دوسرا کم وزن کا اوپر اٹھ گیا ''تم دیکھتے ہو'' میرے پردادا نے کہا ''ہولا (ہلکا) اوپر چڑھ گیا اور بھاری زمین پر رہ گیا'' مجمع نے اس جواب پر واہ واہ کی صدائیں بلند کیں اور میرا پردادا مناظرے میں سے فاتحانہ شان سے کندھوں پر اٹھا کر لے جایا گیا۔

اپنے سارے علم اور دینداری کے باوجود وہ کوئی خشک متعصب عالم نہ تھا۔ عیسائی پادری اکثر اس کے پاس مسائل پر بحث کرنے کے لیے اس کے گاؤں میں آتے اور اس نے ان کے لیے چینی کی پرچ پیالیاں اور پلیٹیں اپنے گھر میں رکھی ہوئی تھیں۔ خود وہ ہمیشہ مٹی کے برتنوں میں کھاتا تھا۔ پادری اسے کافی پسند کرتے تھے اور اس سے بے تکلف تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ایک پادری نے اس سے مذاق کیا ''تم اتنے عالم بنے پھرتے ہو مگر جنگلی عالم ہو کیونکہ تم جنگل میں رہتے ہو'' میرے پردادا نے فوراً خوش طبعی سے جواب دیا ''یہ تو بالکل درست ہے مگر شیر تو جنگل ہی میں رہتا ہے۔'' خوش شکل اور وجیہہ میرا پردادا ایک سو سال سے اوپر تک جیا اور آخر تک اس کی رنگت دہکتے ہوئے تانبے کی سی تھی اور اس کے دانت موتیوں کی لڑیاں تھے۔ یہ میری ماں کے الفاظ ہیں جس نے انہیں بچپن میں دیکھا تھا۔ اس کی خوراک زیادہ تر دو پاؤ دودھ تھی اور کبھی کبھار ایک آدھ سوکھی روٹی۔ وہ بڑا خوش خط تھا اور ہاتھ سے بنے ہوئے موٹے کاغذوں کی ایک کتاب اب بھی ہمارے خاندان میں محفوظ ہے۔ جس پر موٹے قلم سے مختلف فارسی اور عربی اشعر لکھے ہوئے ہیں۔

حافظ محمد عالم کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک ریاست ٹونک میں وزیر بنا ایک اندھا تا لیکن بلا کا ذہین اور طباع میرا دادا عبدالمالک سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے فارسی اور عربی میں بہت کم عمری میں زبردست استعداد پیدا کی۔ اس نے اپنے قصبے میں زندگی کا آغاز بڑے معمولی طور سے کیا۔ وہ پانچ میل دور تحصیل کے دفتر کے باہر عرائض نویسی کیا کرتا تھا مگر اس میں آگے بڑھنے کی

دھن تھا۔ اور وہ اس گزران پر قانع ہونے والا شخص نہ تھا۔ بیس سال کی عمر میں وہ اپنی قسمت آزمانے ریاست بہاولپور میں آیا اور پہلے پہل پٹواری بھرتی ہوا۔ اپنی ذہانت اور قابلیت سے وہ پندرہ سال کے اندر اندر مشیر ال وانہار کے عہدے پر جا پہنچا۔ پنشن کے بعد وہ گجرات میں اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔ مجھے وہ ایک ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں اور تیز حرکات کے بوڑھے آدمی کی حیثیت سے یاد ہے ...... آخری دم تک (وہ پچاسی سال کی عمر میں مرا) اس کے جسم و دماغ چست رہے۔ وہ کئی ایک مذہبی کتابوں اور رسالوں کا مصنف تھا۔ عربی اور فارسی میں بھی نظمیں لکھنے پر قادر تھا۔ اور اپنے آخری برسوں میں اس نے ''شاہان گوجر'' کے نام سے گوجروں کی ایک ضخیم اور یادگار تاریخ قلمبند کی جس کی نثر ادبی خوبیوں سے بالکل ہی خالی نہیں ہے۔

میں اپنی خاندانی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں (جو میں کبھی لکھوں گا) مگر یہاں اس کا موقع نہیں۔ اور جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے یہ واضح کرنے کی خاطر لکھا ہے کہ کس طرح بھیڑوں اور مویشیوں کے گلے بان اور چور آخری پشتوں میں علام' شاعر اور مصنف بن گئے۔ ہماری نسل میں انجینئر' شہری' کلرک' وکیل' اور آڑھتی ہیں مگر ایک بھی ایسا نہیں جو میدانوں میں بھیڑیں چرا سکتا ہو۔ یہ بیشتر دیہاتی خاندانوں کے ساتھ گزری ہے۔ اگر ہمارے مورث اب ہمیں ملیں تو ہم ایک دوسرے کو قطعاً نہ پہچان سکیں گے۔

پھر بھی ہم میں سے ایک آدھ اب بھی دل میں ایک بے پروا گلہ بان اور آوارہ خانہ بدوش ہو گزرتا ہے۔ ایسا شخص مریا ماموں تھا۔

پیشے کے لحاظ سے ایک شہری کلرک مگر ہواؤں کی طرح آزاد۔ اور موجودہ پود میں خود میں اپنے کنبے کا واحد ''جپسی'' ہوں۔

یں ان کاغان کے گوجروں کے پاس اس لیے آ بیٹھا کہ مجھے ان میں اپنے خانہ بدوش مورثوں کی جھلک نظر آئی۔ دس یا پندرہ پشت پہلے ہم بھی ایسے ہی ہوں گے۔ اس وقت میں اپنے پانچ پشت پہلے کے مورثوں کے دوبدو تھا۔

''اس پہاڑی کا کیا نام ہے؟'' میں نے بات شروع کرنے کے لیے پوچھا۔

''یو شیشہ پہاڑی ہو' ان میں سے ایک نے کہا۔ وہ ان تینوں میں معمر اور سنجیدہ تھا۔ اس میں ولیوں کی سی خاموش تمکنت تھی۔

ایک اور آدمی نے جو اپنے پاؤں پر اکڑوں بیٹھا میرے تھیلے کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سب سے زیادہ غلیظ تھا'' ابراہام'' کی دی ہوئی معلومات کو ناکافی سمجھا' اس نے کہا'' بدر پری سیف الملوک کو اٹھا کر شیشہ پہاڑے پر لائیو''

''اس پر کبھی کوئی چڑھا ہے'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں' غلیظ ترین آدمی نے تندی سے میرے خیال کو تردید کی'' اس پہاڑ پر کوئی نہ چڑھ سکو۔ صرف قائد اعظم اس پر چڑھ سکو۔''

قائداعظم کے اس فوق البشری تخیل پر جوان سادہ عجیب الخلقت گڈریوں کے دماغوں میں گھر کیے ہوئے تھے۔ میں مسکرایا' اگر خود قائداعظم بھی اپنے بارے میں ایسا سنتے تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکتے۔ قائداعظم ان کے لیے ایک داستانی ہیرو تھا' وہ نہ سر ہونے والی چوٹیوں پر چڑھ سکتا تھا' قائداعظم ان سادہ لوگوں کے نزدیک یونانی دیو ہرکلس یا توریت کے سامون کی طرح ناممکن کارنامے سرانجام دینے کی قدرت رکھتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے قائداعظم کے انتقال کا بھی نہ سنا تا اور اگر ان کو بتایا جاتا تو وہ اسے کفر کا کلمہ سمجھتے اور اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کردیتے۔ شیشہ پہاڑی پر چڑھ جانے والا آدمی آخر کیسے مر سکتا تھا!

میں نے غلیظ ترین شدمی سے (وہ ایک فاتر العقل غول بیابانی تھا) ایک فضول اور بے حصول حجت بازی شروع کردی اور اس کے دماغ کو وہ چیز ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جس کو سمجھنے کا وہ نااہل تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ قائداعظم ایک بڑے قابل اور مدبر سیاسی لیڈر تھے مگر یقیناً وہ کوہ پیما نہ تھے۔ سرقبیلہ میری توجیہ سے بے حد مرعوب ہوا۔ وہ کچھ سوجھ بوجھ کا شدمی تھا اور اس نے مجھے اس غور اور توجہ سے سنا جیسے میں علم کا سرچشمہ ہوں۔ میری ہر بات پر وہ سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتا اور غلیظ ترین آدمی مجھے ٹوکتا تو وہ اسے ڈانٹ پلاتا ''تم چپ رہو یہ ٹھیک کہو قائداعظم اس پہاڑ پر کیوں چڑھو۔''

پھر میں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں بھی انکا قرابت دار ہوں اور میری گوت بھی گوجر ہے۔ بوڑھا اس پر بظاہر بڑا محظوظ ہوا۔ اس نے مجھ سے متانت سے پوچھا کہ آیا کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں سب گوجروں کے نام چھپے ہوئے ہوں اور یہ کہ اگر مجھے ایسی کتاب کا پتہ ہو تو وہ اسے دیکھنا چاہے گا۔ اس عجیب درخواست کا میں نے جواب دیا کہ ایسی کتاب کوئی نہیں لیکن میرے دادا نے گوجر قوم کی اور اس کی مختلف گوتوں کی ایک تاریخ قلمبند کی ہے جسے میں اگلے سال لیتا آؤں گا (میں تعجب کرتا ہوں کہ اس سے ان پڑھ بزرگ کو کیا حاصل ہوتا۔)

اس کے دونوں ساتھی مجھ سے زیادہ میرے تھیلے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ صرف بوڑھے نے میری باتوں کو سنجیدہ انداز میں شان اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ مجھے حکیم لقمان سمجھ رہا تھا اور میری ہر بات پر بڑی دانائی سے اپنے متین باریش چہرے کو جنبش دیتا۔ ان تینوں میں سرقبیلہ ہی ایک شخص تھا جس میں میری نظر میں روح کی عالی ظرفی کی جھلک دکھتی تھی۔ میں نے اپنے قرابت داروں کو ذاتی حفظان یا صاف ستھرا رہنے کے بارے میں کچھ پند و نصائح کرنے کا ارادہ کیا مگر یہ سوچ کر کہ ان پر میرے الفاظ کا خاک اثر نہ ہوگا اور میں خواہ مخواہ اپنا سانس ہی ضائع کروں گا میں نے اسے معاملے میں چپ ہی رہنے کو ترجیح دی۔

''تم ہمارے ساتھ چلے'' سرقبیلہ نے کہا ''ہم تمہارے لیے بکرا حلال کرے گا۔''

ہم گوجر طبعاً مہمان نوازی اور فیاضی کے لیے کچھ ایسے مشہور نہیں ہیں اور سرقبیلہ کے الفاظ نے مجھے کچھ ششدر کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی یہ دعوت پر خلوص تھی۔ آخر میں اس کا قرابت دار تھا اور میں نے اسے گوجروں پر کتاب بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

''نہیں'' میں نے کہا ''ہم اگلے سال ضرور آئیں گے اور تمہارے پاس ٹھہریں گے؟''

''ضرور'' سرقبیلہ نے کہا ''ہم تمہارے لیے بکرا حلال کرے گا۔''

غلیظ ترین آدمی اپنے سرقبیلہ کی ان مداراتی باتوں سے بے صبر ہو رہا تھا۔ اس کی اور اس کے ساتھی کی نگاہیں بدستور میرے تھیلے پر تھیں۔ وہ مجھے یقیناً اس قابل نہ سمجھتا تھا کہ میرے لیے بکرا حلال کیا جائے۔ لالچ اور بھیڑیے کی گرسنگی اس کی ہر حرکت سے عیاں تھی اور مربی دانشمندی کی گفتگو نے اسے ذرہ بھر بھی متاثر نہ کیا تھا۔ اتنے میں ان کا پہاڑے والا قرابتی تازہ دوہے ہوئے دودھ کا ایک ڈول لے آیا (اس نے پچھڑی ہوئی بھینس کو قابو کر لیا تھا) سرقبیلہ نے مٹی کا برتن میرے حوالے کر کے مجھے دودھ پینے پر اصرار کیا اور میں نے اسے منہ سے لگا لیا۔ دودھ گاڑھا اور میٹھا تھا۔ میں نے لمبے اور گہرے گھونٹ لیے۔

غلیظ ترین آدمی مجھے بے صبر نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ آخر اس نے جھلا کر کہا ''اب بس کر''

سرقبیلہ نے اسے ڈانٹا' میں نے برتن غلیظ ترین آدمی کو دے دیا اور اپنے تھیلے کو کمر پر کس کے اپنے ساتھیوں کی طرف چل پڑا۔ ڈمبل اور ہزاروی جھیل کے کنارے پر کافی کا پانی تیل کے چولہے پر گرم کر رہے تھے۔ انقلابی اور خزانچی کنکریوں پر چت لیٹے تھے۔

لیکن میرے قرابت دار مجھ سے اتنی جلدی کنارہ کش ہونے پر تیار نہ ہوئے وہ میرے پیچھے پیچھے چلے ائے اور آگ کے پاس بیٹھ کر کافی تیار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ان میزبانوں اور قرابتیوں نے وہاں اپنی حرص اور ندیدے پن کا شرمناک مظاہرہ کیا (عالی ظرف سرقبیلہ بھی دوسروں سے کم ہی مفتر ثابت ہوا) غلیظ ترین آدمی تو بالکل نا قابل برداشت تھا۔ یہ مٹی کی رنگت کے پچکے گالوں اور میلی ڈاڑھی والا کوہستانی غول آگے بڑھ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ ہمارے برتنوں اور ڈبوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا۔ ہر چند منٹ کے بعد وہ کبھی کافی اور کبھی پنیر کے ڈبے کو اٹھا لیتا اور اسے سینے کے ساتھ لگا کر بچے کی طرح بضد ہوتا ''یو ہم رکھے گا۔'' ہم بڑے مشکل سے بہلا پھسلا کر اس سے ڈبہ لیتے جسے وہ بڑی بے دلی سے دینے پر رضامند ہوتا۔ میں سرقبیلہ کی توجہ اس کے قرابتی کی اس چیرہ دستی کی طرف منعطف کرتا مگر بے سود تھا۔ اس نے خود تو ہماری چیزوں کو ہتھیانے اور اڑانے کی کوشش نہ کی مگر اس کی پر اسرار خاموشی غلیظ ترین آدمی کی ان چھینا جھپٹیوں کی تائید کر رہی تھی۔ وہ سب حریص اور خطرناک تھے۔ ہمیں کسی قدر فکر لاحق ہوا کہ کہیں وہ ہمیں لوٹنے

پر تیار نہ ہو جائیں۔

غلیظ ترین آدمی نے میری کلائی پر ہاتھ مارا "یہ میں لوں گا۔"

"اسے چھوڑو" میں نے صلح جویانہ لہجے میں کہا "اگلے سال میں تمہارے لیے ایک درجن ایسی لیریں لے آؤں گا۔" میں نے سر قبیلہ سے اپیل کی کہ غلیظ ترین آدمی کو سمجھائے۔

مگر غلیظ ترین آدمی نے میری ٹائی کو چھوڑ کر میرے ہیٹ کو اچک لیا اور اپنی گندی ٹوپی اتار کر اسے جوؤں سے بھرے ہوئے سر پر رکھ کر منہ بنانے لگا "یہ ٹوپی میں لوں گا۔"

ہیٹ میں نے بڑی مشکل سے اس سے واپس لیا۔ اچانک اس نے میرے کوٹ کی اوپر کی جیب میں رکھا ہوا پائپ اچک لیا۔ میں نے اس کی منت کی۔ اسے ڈرایا' دھمکایا۔ لیکن اس پائپ سے وہ کسی صورت بھی دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اگلے سال پھر آ رہا ہوں اور اس کے لیے ایک درجن ایسے ہی پائپ لاؤں گا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ پائپ ٹوٹا ہوا ہے اور اس کے قابل نہیں ہے۔ میں نے سر قبیلہ سے اپیل کی۔ غلیظ ترین آدمی اسے اپنے سینے سے چمٹا اٹھ کھڑا ہوا اور ریملا بن کر ادھر ادھر ناچنے لگا...... اس موقع پر ہزاروی نے اپنی قمیص کے نیچے سے کوئی چیز باہر نکالی...... یہ...... یہ پستول تھا۔

سر قبیلہ نے فوراً "غلیظ ترین آدمی کو ڈانٹا" تم کیا کرتا ہے' یہ پائپ دے دے" غلیظ ترین آدمی نے مجھے فوراً پائپ دے دیا۔ پستول نے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیے تھے۔

اس اثنا میں ڈمبل نے کافی تیار کر لی تھی۔ ہم نے اس میں بھینس کا بچا ہوا دودھ ملایا۔ کافی ہم نے خود بھی پی اور ان قرابت داروں کو بھی پلائی۔ ہم اب ان کوہستانی گڈریوں کی جلد از جلد پیٹھیں دیکھنا چاہتے تھے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میں نے آخر بچے ہوئے دودھ کا ٹین غلیظ ترین آدمی کو دے دیا۔ اس سے بھی اس کی تسلی نہ ہوئی اور وہ دور بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک چار سالہ بچی کو اٹھا لایا۔ بچی کو میرے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے اس کا نام پوچھا' اسے پچکارا' اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جیسی کہ مجھ سے توقع کی جا رہی تھی اس کی ہتھیلی پر دو روپے رکھ دیے۔ سر قبیلہ نے میرے اس عمل کو سراہتی نگاہوں سے دیکھا اور اگلے سال میرے لیے بکرا حلال کرنے کے ارادے کا اعادہ کیا۔ آخر کار وہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے' میں کبھی زندگی میں اتنا خوش نہیں ہوا جتنا اپنے ان قرابت داروں کے رخصت ہونے پر ہوا۔

پانچ منٹ کے بعد ہم نے انہیں اپنے ڈھور ڈنگروں کے ساتھ ایک قافلے کی صورت میں سامنے سے گزرتے دیکھا' سر قبیلہ اپنی

لٹھی ٹیکتا ہوا سب سے آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے مویشیوں کی قطاروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کے دوسرے قرابتی تھے (غلیظ ترین آدمی کے ہاتھ میں ہمارا جمے ہوئے دودھ کا ٹین تھا) بعض عورتیں پیدل تھیں بعض خچروں پر۔ ان میں نوخیز بھی تھیں اور ادھیڑ عمر بھی۔ ایک دو کی جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ انقلابی نے ان کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے گھورا۔

جرمن کیمپ

انقلابی اور خزانچی ہم سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھے اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے' تھوڑی دیر کے بعد خزانچی نے ڈمبل کو آواز دی ''ڈمبل صاحب ذرا بات سننا ڈمبل ان میں جا شامل ہوا۔ میں نے انقلابی کو بڑی اہمیت اور رازداری کے انداز میں ڈمبل سے باتیں کرتے دیکھا جن کے دوران میں وہ بار بار ہماری طرف تشویشناک نگاہیں ڈالتا تھا۔ خزانچی نے اب مجھے بھی بلالیا میں بھی ہزاروی کو پائپ پیتا چھوڑ کر ان میں جاملا...... یہ ایک مجلس مشاورت تھی جس سے لیڈر کو خارج کر دیا گیا تھا..... دراصل یہ کانفرنس لیڈ کے خلاف تھی۔

انقلابی نے اپنے وسوسوں کا اظہار کیا کہ ہزاروی کے پاس پستول ہے۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے یا کیا ہے؟ اس کی معیت میں سفر کرنا محفوظ نہ تھا کیا پتہ وہ واپسی میں پستول دکھا کر ہماری نقدی وغیرہ چھین لے۔

میں نے ان خداشات کا مذاق اڑایا اور ہزاروی کی طرفداری کی ''ہزاروی اس قسم کا آدمی معلوم نہیں ہوا'' میں نے کہا ''سرحد میں بیشتر لوگ اپنے پاس اسلحہ رکھتے ہیں۔ یہ تو بلکہ اچھی بات ہے کہ ہم میں سے ایک کے پاس پستول ہے۔''

خزانچی نے کہا کہ ''ہر حالت میں ہمیں اس سے محتاط رہنا لازم ہے'' اس نے کہا کہ ناران کے ہوٹل والے نے اس کو بلا کر ہزاروی کے خلاف اسے خبردار کیا تھا اور تعجب ظاہر کیا تھا کہ ہمارے ساتھ کیسے سفر کر رہا ہے۔ خزانچی نے ہوٹل والے سے دریافت کیا تا کہ آیا ہزاروی اس کا گرائیں تھا اور وہ اسے جانتا تھا جس پر ہوٹل والے نے قسم کھائی تھی کہ اس نے ہزاروی کو زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔

انقلابی نے کہا ''اس شخص کا کوئی اعتبار نہیں' اس نے تو ہمیں یہ بتایا ہے کہ ہوٹل والا اس کا گرائیں ہے اور وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے''

اس کانفرنس کے بعد جب میں لیڈر کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا ''کیوں کیا بات تھی''

مگر پارٹی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس سے اپنے وسوسوں کے بارے میں کچھ نہ کہوں' میں جھوٹ بولا اور ہنستے ہوئے کہا ''انہیں ڈر ہے کہ گوجر واپس نہ آجائیں''

''آپ گوجروں کونہیں جانتے'' اس نے کہا ''وہ بڑے بزدل لوگ ہیں۔ یہ اپنا پستول ہی ان کو دور رکھنے کے لیے کافی ہے۔''

میں نے اس کے ہتھیار میں دلچسپی کا اظہار کیا ''اس کو چلا کر دیکھنا چاہیے۔''

''میرے پاس اس کا بارود نہیں ہے۔'' ہزاروی بولا ''اسے میں کاغان کے ایک سید دوست کو دینے کی غرض سے لایا ہوں اس نے مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ اسے ایک پستول درکار ہے۔ اب واپسی پر میں یہ پستول اس کے حوالے کر دوں گا''

جب میں نے یہ بات پارٹی کو بتائی کہ ہزاروی کے پاس پستول کی گولیاں نہیں ہیں اور وہ اسے استعمال نہیں کر سکتا تو اس کے وسوسے کچھ دور ہوئے اور ان کی جان میں جان آئی۔

''پھر بھی'' انقلابی نے کہا ''اس شخص کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ جھوٹ بول رہا ہو۔''

ہم نے جھیل پر کوئی دو گھنٹے گزارے۔ انقلابی اور خزانچی تھکے ہوئے لیٹے رہے۔ لیڈر ڈمبل اور میں نے اس کے دکھنی کونے تک چل کر اس کا جائزہ لیا سیف الملوک کوئی بڑی جھیل نہیں۔ لمبائی میں زیادہ سے زیادہ آدھا میل اور تقریباً اسی قدر چوڑی' تری سمت پر اس کی کل لمبائی ایک شاندار سبزے پہاڑ سے پشت ملائے ہوئے ہے۔ (یہ وہی پہاڑ تھا جس پر ہم پہلے روز چڑھے تھے) ...... شفاف یاقوتی پر سکون پانی پر برف کے بڑے بڑے تودے آنند اور دلی طمانیت کی تصویر تھے۔ برف سے ڈھکی ہوئی شیشہ پہاڑی ہمارے بائیں طرف جھیل کے نرمل یاقوت میں اپنا چہرہ دیکھنے کے لیے امڈی آتی تھی۔ یہ جگہ اتنی دور' اتنی تنہا' اتنی سحر زدہ کسی فسوں گر کا کرشمہ معلوم ہوتی تھی۔...... پریوں اور عفریت کا مسکن' آدمی یکلخت چونک کر اس المناک علم سے دوچار ہوتا تھا کہ یہاں کی پریاں اور عفریت وادی کے غلیظ اور ناتراشیدہ گوجر ہیں مشیت کی ستم ظریفی!

جھیل کے دکھنی کنارے پر ہم ایک کیمپ کے بچے کھچے آثار کے پاس آ نکلے کسی سر پھرے سیلانی نے حال ہی میں یہاں خیمہ کیا تدھا۔ یہاں پر جلی ہوئی لکڑیاں تھیں تین چار خالی ٹین (ایک مچھلی کا) اور بلیک کیٹ وہسکی کی خالی بوتل خیمے کی میخیں ابھی تک کنکریلی زمین میں گڑھی ہوئی تھیں۔ اپنے ہم وطنوں کی مادہ پرست' منچلے پن سے خالی روحوں کو جانتے ہوئے میں نے اور ڈمبل نے فیصلہ کیا کہ خیمہ کرنے والا کوئی یورپین ہوگا۔ شاید وہ شیشہ پہاڑی پر چڑھنے کے لیے آیا تھا۔ ہمارا خیال درست نکلا کیونکہ کیمپ کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری نظر ایک بڑے پتھر پر پڑی جس پر لاطینی حروف میں چاقو سے یہ حرف کھدے ہوئے تھے...... ہر فرانز ہاہن آگے انہی حروف میں کوئی عبارت لکھی تھی۔ یہ عبارت زیادہ واضح کھدی ہوئی نہ تھی۔ ہم نے قیاس لگایا کہ یہ من چلا کوئی جرمن ہوگا۔

اس دریافت پر ہمارے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آخر دنیا میں اب بھی ایسے لوگ تھے! ڈمبل اور میں نے اس اکیلے یاتری کے

نام کے نیچے ایک چاقو سے اپنے نام کھودے ان کے آگے انگریزی میں اس معنی کی عبارت کا اضافہ کیا۔

محمد خالد اختر

ڈمبل

دو یاتری جو ۳۰ مئی ۱۹۵۳ء کو یہاں آئے۔

ہمارے ساتھی ہمیں آواز دے رہے تھے۔ ہم نے خزانچی کو اوپر سورج کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔ وہ اب آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اگر ہم شام سے پہلے پہلے ناران پہنچنا چاہتے تھے تو ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر ہم اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔

ہم نے (یہ ''ہم'' میں ڈمبل اور خود کے لیے بولتا ہوں) سیف الملوک کی اس وادی پر ایک درد اور کسک کے ساتھ پیٹھ کی۔ آدمی کی زندگی چند روزہ ہے۔ کون جانتا تھا کہ ہم پھر اس یاقوتی جھیل اور ان بچی برفوں پر نظر ڈال سکیں گے۔ ڈمبل اور میں نے ایک دوسرے سے عہد باندھا (ہم جانتے تھے کہ اسے نبھانا اب ناممکن ہوگا) ہم اگلے سال یہاں پھر آئیں گے اور ہر فرانز ہامن کی طرح اس جھیل کے کنارے کئی روز کیمپ کریں گے...... جھیل جو جان کیٹس کے سانیٹ کی طرح خوبصورت تھی...... آخر اس چڑھائی پر پہنچ کر جہاں سے چکر کھاتی ہوئی پگڈنڈی پہاڑ کے دوسرے طرف جھیل اور وادی کو اوٹ میں چھپاتی چلی گئی تھی۔ ہم نے مڑ کر وادی پر ایک آخری محبت بھری اداس نگاہ ڈالی۔ ہم ایک بھاری دل کے ساتھ پگڈنڈی کا موڑ گھومے' ڈمبل اور میرے دل میں ایک ہی خیال تھا۔ کیا قسمت ہمیں پھر یہاں لائے گی۔ کیا اس دفتری کرسیوں اور فائلوں کی دنیا کو ہمارا لوٹ جانا ضروری تھا عزت داروں اور رواجی قدروں کی دنیا میں' جہاں غلامی' اکتاہٹ' حرص اور بے رحمی کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایک لیڈر کی بے وقری

واپسی کے سارے رستے میں ہزاروی وادی کے گوجروں کی باتیں کرتا رہا ''وہ'' اس نے کہا ''اس سے آدھے غریب بھی نہیں' جتنے نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس بہت روپیہ ہوتا ہے' وہ متمول لوگ ہیں۔ ان کے پاس بھیڑوں' بھینسوں اور بکریوں کی بڑی دولت ہوتی ہے۔ وہ اپنے روپے میں سے ایک پائی بھی اپنے اوپر صرف کرنا حرام سمجھتے ہیں اور سخت بخیل ہوتے ہیں۔ وہ وادی کے یہودی اور سود خور ہیں۔ یہاں تک کہ بعض سید بھی ان کے ہزاروں کے مقروض ہیں۔ کسی کو ان کی بوسیدہ اور مسکین وضع قطع سے فریب نہ کھانا چاہیے'' جو کچھ ہزاروی نے مجھے بتایا ممکن ہے یہ سچ ہو اور ممکن ہے جھوٹ ہو ہزاروی کے دل میں گورجوں کے خلاف نسلی تعصب اور

نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر اس کی ساری باتیں سچ بھی تھیں تو بھی گوجروں کا بخل' ان کی حرص' ان کی ناخوشگوار خصلت صدیوں کے جبر واستبداد کا نتیجہ تھی۔ خود حفاظتی کے جذبے نے انہیں یہ سب کچھ بنا دیا تھا۔ وادی کے باشندے ان سے نفرت کرتے تھے اور وادی کے مالک ان کے مالک ان سے کئی طریقوں سے روپیہ بٹورتے تھے اور ان کی بھینسوں اور لڑکیوں کو اٹھوا لے جاتے تھے۔ اس مستقل ہراس اور ظلم کی فضا میں قدرتی طور پر بقا کی کشمکش نے ان میں بعض گھناؤنی صفات کو نشوونما دے دی تھی۔

میرے دادا نے اپنی تاریخ میں کئی انگریز مورخوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ ہم وسطی ایشیا سے آنے والے ہنزا اور تھیوں کی اولاد ہیں۔ لیکن میری گوجروں کی اصل کے متعلق اپنی تھیوری ہے جس پر میرا اٹل یقین ہے...... ہم تھین اور ہنز کی اولاد نہیں ہیں اور نہ ہی ہم اگنی کل راجپوت (آگ کے بچے ہیں...... ہم اسرائیل کے بارہ کھوئے ہوئے قبیلوں میں سے ایک ہیں۔

یہ ایک ہی پر اکان راہ تھی میں اور ہزاروی اپنے ساتھیوں سے کافی آگے آئے تھے۔

ڈمبل بھی زادیہ تر ان کے ساتھ رہا۔ انقلابی اور خزانچی کچھ تو تھکاوٹ کی وجہ سے اور زیادہ تر اپنے وسوسوں کے سبب ہم سے جدا ہو گئے تھے۔ اور اپنے کو ایک محفوظ فاصلے پر جلو میں رکھے ہوئے تھے۔ انہیں ابھی تک ہزاروی کا اعتبار نہ تھا وہ اس کے پستول کی زد سے باہر رہنا چاہتے تھے۔

جب ہم آخری پہاڑی پر چڑھ رہے تھے منزل سے زیادہ دور نہ تھے تو ہم نے اپنے ساتھیوں کو تیز تیز قدم اٹھاتے اور دوڑتے ہوئے دیکھا کسی ڈر نے انہیں پر دے دیئے تھے۔ وہ ہمارے نزدیک پہنچے۔ انقلابی اور خزانچی کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انقلابی نے قسم کھائی کہ اس نے ایک ریچھ دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بڑا اور سیاہ ریچھ ہے اور غالباً کافی دور سے ہمارا پیچھا کر رہا ہے) یہ ریچھ اصلی تھا یا انقلابی کے دہشت زدہ تخلیل کی پیداوار ڈمبل اور خزانچی کو یہ ریچھ نظر نہ آیا تھا' بہر حال ان کے ڈر نے انہیں ہمارے ساتھ ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا۔ لیڈر کی اہمیت اور ساکھ پھر بڑھ گئی۔ وہ اس علاقے سے واقف تھا اور پھر اس کے پاس پستول تھا۔

ہمارے ننھے گائیڈ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلی "اس جگہ ریچھ نہیں ہیں۔"

کوئی تین بجے کا وقت ہوگا (سورج پچھمی پہاڑوں کی چوٹیوں کے نزدیک پہنچ رہا تھا) کہ ہم ناران میں داخل ہوئے۔ ہم چھ بجے اپنے ہوٹل سے نکلے تھے جانے اور آنے میں ہمیں تقریباً نو گھنٹے لگے اور ان نو گھنٹوں میں سات گھنٹے ہم برابر چلتے رہے تھے۔ اور وہ بھی کسی سیدھی ہموار سڑک پر نہیں بلکہ کٹھن ڈھلوانی پہاڑی راہ گزروں پر ہم نڈھال ہو رہے تھے۔

ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تو حسین جان ایک گٹھیلے یورپین کو وہ پیا سے باتیں کر رہا تھا یہ یورپین ایک لڑکا سا لگتا تھا...... خاکی لباس میں ملبوس اپنے کندھے پر ایک بہت بھاری سفری تھیلا باندھے اور خچر کی طرح جفاکش۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ سیاہ بال چست اور باریک کٹے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ چوڑا چمکیلا اور مضبوط تھا۔ وہ انگریزی میں حسین جان کو سنجیدگی اور جھنجھلاہٹ سے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جسے سمجھنے میں جیپ ڈرائیور کو دقت ہو رہی تھی میں نے دو تین دفعہ یورپین کو لفظ ڈاکٹر ڈاکٹر دہراتے سنا سو میں ان کی مدد کو آیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے انگریزی میں یورپین سے پوچھا۔

''میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں'' اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا کہ ''ڈاکٹر ناران میں کب آتا ہے۔ میں باٹا کونڈی سے آرہا ہوں' وہاں ایک بیمار سخت تکلیف میں ہے۔ اس کے جسم میں کیڑے پڑے ہوئے ہیں' وہ تین چار روز میں مر جائے گا ...... ڈاکٹر کو اس مریض کو فوراً جا کر دیکھنا چاہیے کیونکہ مریض یہاں نہیں آسکتا۔''

میں نے حسین جان کو ساری بات سمجھائی۔ اس نے کہا ڈاکٹر ناران میں ایک روز کے لیے آتا ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ آج اس کے آنے کا دن ہے یا نہیں وہ نران سے آگے نہیں جاتا اور وادی کے اوپر کے مریض ضرورت پڑنے پر دوا دارو کے لیے ناران میں آتے ہیں۔

''اس کی زندگی خطرے میں ہے'' یورپین نے کہا ''اسے فوراً طبی امداد ملنی چاہیے۔ میں نے اسے سڑک کے کنارے ایک جھونپڑی میں چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے لیے جاتے ہی ڈاکٹر بھیج دوں گا۔''

حسین جان کو اس بات میں شبہ تھا کہ ڈاکٹر باٹا کونڈی میں مریض دیکھنے کے لیے تیار ہوگا۔

''جب ڈاکٹر یہاں آتا ہے تو وہا کہاں ٹھہرتا ہے۔'' یورپین نے پوچھا۔

''ڈاک بنگلے کے پاس''

''میں اس کا پتہ کرتا ہوں'' اور وہ ایک فکر آلودہ چہرے کے ساتھ مگر جیسے عزم صمیم سے گلی کی اترائی پر ڈاک بنگلے کی سمت چل پڑا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے حسین جان سے پوچھا۔

''جرمن ہے۔ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا ہے۔ یہ اب بابوسر پاس اور باٹا کونڈی سے لوٹ رہا ہے۔''

''کیا باٹا کونڈی میں ڈاکٹر کے جانے کا امکان ہے؟''

بالکل نہیں۔ حسین جان نے کہا "ڈاکٹر لوگ میں اتنا درد کہاں۔ وہ لالچی ہوتا ہے۔"

ہر فرائز! ہا ہن! میں نے سوچا تمہیں معلوم نہیں کہ ہزاروں لاکھوں انسان اس فلک میں طبی امداد کے بغیر مرتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر ایک مرے ہوئے غریب آدمی کے لیے جیپ میں بیس میل تک نہیں جا سکتے اور نہ ہی اسے ایمبولنس کار میں ہسپتال لایا جا سکتا ہے۔ ہر فرانز! یہ امیر اور خوش حال آدمیوں کا ملک ہے...... ان کا ملک ہے جو ڈاکٹروں کی موٹی فیسیں ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ باٹا کونڈی کا وہ مریض مرتی ہوئی امدی کے ساتھ ڈاکٹر اور ایمبولنس کا تا دم مرگ انتظار کرتا رہے گا۔ ہر فرانز! وہ مر جائے گا۔ لیکن اس کا کیا ہم سب کو آخر ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔

حسین جان نے ہمیں اطلاع دی کہ اس وقت ایک جیپ پولیس افسر کا سامان لے کر کاغان جانے والی ہے اور اگر ہم چاہیں تو اس میں کاغان تک سفر کر سکتے ہیں۔ یہ خبر اتنی اچھی تھی کہ ہمیں اس پر یقین نہ آیا۔ کیا حسین جان ہماری ٹانگ کھینچ رہا ہے؟ ہم اس وقت جیپ کے ملنے کی توقع نہیں کرتے تھے اور ہم نے خود کو نران کے اس غار میں ایک رات اور ٹھہرنے پر تیار کر لیا تھا۔ بالاکوٹ کو جانے والی سب جیپیں ناران سے تڑکے روانہ ہو جاتی ہیں۔ مگر حسین جان قطعی سنجیدہ تھا۔ اس نے قسم کھائی سو حد درجہ تھکاوٹ کے باوجود ہم نے فیصلہ کیا کہ ناران میں ایک اور رات نا قابل برداشت ہو گی اور ہم جیپ میں کاغان جائیں گے۔ ہم نے ہوٹل والے سے اپنا حساب پوچھا' اس نے ایک کاغذ پر پہلے ہی حساب تیار کر رکھا تھا۔ بستر کی اس نے الگ رقم چارج کی تھی کل رقم پچیس تیس بنتی تھی۔ اسے میں نے اور ڈمبل نے اس آرام اور کھانے کے عوض جو ہمیں اس غار میں ملا تھا۔ بہت زیادہ خیال کیا۔ ہزاروی کا گرائیں' ہمیں بے شرمی سے لوٹ رہا تھا۔

خزانچی نے اس رقم کی ادائیگی کر دی۔ اب انقلابی نے کہا کہ بہتر ہو گا۔ ہم سب اپنا اپنا حساب چکا دیں اور اس سے آگے اپنا اپنا خرچ کو د کریں' خزانچی نے اپنی ڈائری نکالی۔ جس میں سب کا مشترکہ کھاتا درج تھا۔ بالاکوٹ سے یہاں تک ہم سب کے کل اخراجات پینسٹھ ستر روپے کے قریب بنتے تھے۔ اس رقم کو چار پر تقسیم کیا۔ سترہ اٹھارہ روپے فی کس خرچ آیا۔ ڈمبل اور میں نے اپنے پینتیس روپے دے کر حساب بیباق کر دیا۔ ہزاروی کی باری آئی تو اس نے کھسیانا ہو کر اپنی جیب سے ساڑھے چار روپے نکالے "ابھی یہ ساڑھے چار روپے لے لو" اس نے خزانچی سے کہا "میری جیب میں یہی رقم ہے ہے کاغان میں اپنے سید دوست سے پیسے لینے ہیں۔ وہاں چل کر میں اس کی ادائیگی کر دوں گا۔" خزانچی اور انقلابی کے چہرے لٹک گئے لیکن انہوں نے کہا کچھ نہیں۔

سامان اٹھائے اور سفری تھیلے کندھے سے لٹکائے ہم ناران کے ہوٹل سے رخصت ہوئے۔ لیڈر نے میرے تھیلے کو لے جانے پر

اصرار کیا اور جب میں نہ مانا تو اس نے انقلابی کا چھوٹا ٹرنک اٹھالیا۔ وہ اب پھر سے پورا بستہ بردار بن کر ہمارے دلوں میں گھر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں خوشامد اور ہمیں خوش کرنے کی خواہش نمایاں تھی۔ مگر اس نے اپنا بھرم کھو دیا تھا۔ پارٹی نے اس سے حقیقتاً ایک بستہ بردار کا سا سلوک روا رکھنا شروع کر دیا۔ اس کی ذلت میں اب کوئی کمی نہ رہ گئی تھی۔

ڈاک بنگلے کے سامنے جیپ پولیس افسر کے بستروں اور سامان سے لبالب لدی پھندی کھڑی تھی۔ ہمیں کھلی جیپ میں سامان کے اوپر چڑھ کر بڑے غیر آرام دہ انداز میں بیٹھنا پڑا۔ اس طرح کہ ہماری ٹانگیں نیچے ہوا میں لٹک رہی تھیں اور ہم جیپ کے مختلف حصوں کو تھامے ہوئے تھے۔ مبادا ہم کسی دھچکے یا سڑک کا ناگہانی تیز موڑ گھومنے پر نیچے آ رہیں۔ ڈرائیور کے ساتھ کی فرنٹ سیٹ انتظامیہ کے ایک افسر کے لیے محفوظ تھی اور جوں ہی وہ حضرت اپنی نشست پر براجمان ہوئے ہم چل پڑے۔ ہماری سخت تھکان اور میلے کپڑے جن کو ہم نے ساتھ دن سے جسم سے نہ اتارا تھا۔ ہمارا تکلیف دہ اور خطرناک بیٹھنے کا طریقہ غرضیکہ ہم خود کو بے حد خراب وخستہ محسوس کر رہے تھے اور اپنی حالت زار پر دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتے تھے۔ اس دن اس جیپ میں بیٹھے ہوئے ڈمبل اور میں اس کرے کے دو ناشاد ترین سیلانی تھے۔ ایک اور چیز جو ہمیں ذہنی طور پر دق کر رہی تھی...... ہماری مالی حالت تھی۔ کیا ایبٹ آباد پہنچ کر اور راستے کے سارے اخراجات ادا کرنے کے بعد ہمارے پاس گھر پہنچنے کا تھرڈ کلاس کا کرایہ بچ رہے گا؟ مگر اس امر کے امکانات کافی روشن تھے کہ ہم روپیہ ختم ہو جانے کی وجہ سے ایبٹ آباد ہی گرفتار مصیبت ہو جائیں گے...... ہم جس طرح بھی سوچتے تھے اور حساب لگاتے تھے ہمیں اپنا مستقبل سیاہ نظر آتا تھا۔

اور ہماری طبیعتیں اب پہاڑیوں سے اچاٹ ہو چکی تھیں۔ اس واپسی کے سفر میں کاغان کی وادی میں ہمارے لیے کوئی جاذبیت باقی نہ رہی تھی۔ یہ وادی ایک ایسی کتاب تھی جسے ہمیں دوبارہ پڑھنا پڑ رہا تھا اور ہم جلد از جلد ایبٹ آباد پہنچ جانا چاہتے تھے۔

راستے میں ایک واقعہ ہوا جس نے ہمیں بے بسی کے غصے اور کراہت سے بھر دیا۔ ایک موڑ پر جیپ گزرنے سے ایک ٹٹو بدک اٹھا۔ ایک چھوٹا گل گوتنا بچہ ٹٹو پر بیٹھا تھا اور ایک آدمی...... غالباً اس کا باپ (وہ شریف نرم رو کاغانی لگتا تھا) ٹٹو کو باگ سے پکڑے تھے' ٹٹو بھڑکا' اچھلا اور آدمی کی کوشش کی بیا وجود عین سڑک کے کنارے پر جا پہنچا چھوٹا بچہ خوف کی تصویر بنا ٹٹو کی گردن سے چمٹ گیا اور ٹٹو پرے نیچے چٹانوں پر گرنے سے بال بال بچا۔ آدمی نے آ کر بڑی مشکل سے ٹٹو کو قابو کر لیا۔ ڈرائیور نے جیپ روک لی۔ فرنٹ سیٹ والا افسر غضبناک ہو کر نیچے اترا اور گالیاں دیتے ہوئے اس نے ٹٹو والے آدمی کو چار پانچ تھپڑ اور گھونسے رسید کر دیئے "سڑک کے بیچ میں چلتے ہوئے' بچے کا خون ہماری گردن پر ڈلوانے لگے تھے" پھر گالیوں کی ایک اور پھلجھڑی چھوٹی وہ اس بہیمیت کا مظاہرہ

کرنے کے بعد غصے سے لال پیلا جیپ میں آبیٹھا...... افسر کا غصہ ٹھیک ہی تو تھا جیپ پر سوار اس افسر پر غصہ بہت دیر تک سوار رہا۔

کاغان پہنچنے سے پہلے ہم ایک جگہ سڑک کے کنارے ٹھہرے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا تھا اور افسر کو بحیثیت کو ایک دیندار مسلمان اپنے مالک کی بارگاہ میں جھکنا تھا۔ جتنی دیر وہ نماز میں مصروف رہا ہم ستانے کے لیے پاس ہی ایک پل کی نیچی دیوار پر جا بیٹھے ڈرائیور نے یہاں ہم سے کرایہ جمع کیا جو کاغان تک غالباً دو ڈھائی روپے کے لگ بھگ تھا۔ جب لیڈر کی باری آئی تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ فی الحال میں اس کا کرایہ ادا کردوں۔ کاغان میں یقیناً وہ اپنا سارا حساب بیباق کردے گا...... اب اس نے اپنے کھسیانے پن پر قابو پالیا۔ اس نے میرا پائپ ادھار مانگا اور دلجمعی اور آسودہ خاطری سے پینے لگا۔ اس آدمی کی طرح جس کے لیے دولتمندی گویا ہاتھ باندھے اس کا انتظار کررہی ہو۔

افسر کے نماز پڑھنے کے بعد ہم روانہ ہوئے اور سورج غروب ہونے سے پہلے کاغان میں داخل ہوگئے۔ ہم ایک ہوٹل کے سامنے اترے۔ اس کا ایک مختصر سا صحن تھا اور ایک چھوٹی پتھریلی دیوار سے سڑک سے جدا کیے ہوئے تھی۔ ٹین کی دوتین کرسیاں اور مونڈھے پڑے تھے۔ ہزاروی نے ہمیں یہاں انتظار کرنے کی ہدایت کی۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے سید کا پتہ کرنے جارہا ہے اور پندرہ بیس منٹ میں ہمیں آکر ملے جاءگا۔ "سید کو مفت میں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے" میں نے کہا "ہم ہوٹل میں مزے سے رہ سکتے ہیں"

ہزاروی نے اس پر سخت احتجاج کیا "ہوٹل میں خواہ مخواہ پیسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سید بڑا مہمان نواز ہے۔ وہ ہماری خوب خاطر مدارات کرے گا۔ آپ دیکھیں گے"

ہمیں وہاں انتظار کرتا چھوڑ کر ہزاروی سبزہ اگے چٹیلے میدان میں سے پہاڑیوں پر بنے بنگلہ نما مکانوں کی طرف چل پڑا۔ ہم صحن میں پڑے ہوئے مونڈھوں پر بیٹھ کر ہزاروی کا انتظار کرنے لگے۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا لیکن ابھی تک ہزاروی کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ ہوٹل والوں نے (وہ دو نرم طبیعت خوش اخلاق اٹھارہ انیس سالہ لڑکے سے تھے غالباً بھائی) ہم سے ایک دوبارہ آکر پوچھا۔

"تساں نی رات ٹھرنا ہے تو اساں مرغی حلال کرو سیاں"

ہم نے کہا کہ نہیں ہم اپنے دوست کا انتظار کرہرے ہیں اور وہ ابھی آتا ہوگا۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ سورج غروب ہوگیا۔ بیگم کی سی شام آگئی مگر ہزاروی اب بھی نہ آیا' ہمیں کچھ کچھ یقین ہونے لگا کہ وہ ہمیں جل

دے گیا ہے اور اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ مجبوراً ہم نے ہوٹل والوں کو کھانا تیار کرنے کے لیے کہا۔ ستارے آسمان میں نمودار ہونے لگے اور خنکی بڑھ گئی آخر ہم اپنا سامان اٹھا کر ہوٹل کے برآمدے میں جا بیٹھے جہاں ایک چھوٹی میز رکھی تھی اور اس کے گرد ٹیک والے بینچ۔ لڑکوں کنے ہمارے لیے لوہے کی انگیٹھی سلگا دی' انقلابی کے لیے حقہ تازہ کر دیا۔ ہم نے گرما گرم میٹھی چائے پی اور بالکل ایسا محسوس کیا جیسے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔ لڑکوں نے گراموفون ہماری تفریح کے لیے چلا دیا۔

دو تین اور لوگ مسافروں سے غپ شپ لڑانے اور آگ تاپنے کے لیے آبیٹھے۔ ان میں ایک کاغان کے وائرلیس سٹیشن آپریٹر تھا۔ سیاہ سوٹ میں بیس بائیس برس کا گٹھیلا۔ وہ کاغان میں اپنی زندگی سے سیر ہو چکا تھا وہ جگہ بور تھی۔ اس نے کہا" نہ یہاں آدمی کسی سے مل سکتا ہے نہ کہیں جا سکتا ہے۔" وہ اپنے کو ایک جلاوطن قیدی کی طرح محسوس کرتا تھا...... باہر کی دنیا سے بلکل "کٹ آف" اگر اسے دو تین مہینے اور یہاں پر رہنا پڑا تو وہ قطعی پاگل ہو جائے گا۔" وہ اپنے بتادلے کی کوش کرر ہا تھا۔

"شام کو یہاں دو تین گھنٹے کے لیے آبیٹھتا ہوں۔ یہی یہاں کی تفریح ہے۔"

اس نے کہا۔

ہم نے اس سے ہمدردی کی" واقعی ایسی جگہ میں پانچ چھ مہینے پھنس جانا خوفناک بات ہے۔" ہم نے اس کی ہمت کی داد دی کہ وہ اس جلاوطنی کی زندگی کو اتنی مدت برداشت کر سکا ہے۔ یہ اس حقیقت کی مثال تھی کہ کس طرح نہایت رومینٹک جگہیں بھی ان لوگوں کے لیے رومینٹک نہیں رہتیں جنہیں پیٹ کی خاطر وہاں رہنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وائرلیس آپریٹر اس قدر اور اس حد تک ناشاد اور بیزار نہ ہوتا اگر اس کی شدی ہو چکی ہوتی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ وہاں رہ رہا ہوتا' وہ ایک دلچسپ اور جاندار نوجوان تھا اور اس نے مجھے پیش کش کی کہ اگر میں چاہوں تو وہ میرے لیے راولپنڈی وائرلیس پیغام بھیج سکتا ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

ہم نے اب ہزاروی سے بالکل ہاتھ دھو لیے۔ لڑکوں نے ہمارے سامنے کھانا لگا دیا۔ جب ہم کھانا کھا رہے تو ہزاروی آ نکلا' اس کا چہرہ ایک پٹے ہوئے آدمی کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اس پر مظلومیت برس رہی تھی۔ وہ خاموش اور اکھڑا اکھڑا وائرلیس آپریٹر کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کی ترکی تمام ہو چکی تھی ہم نے اس سے پوچھا کہ اس نے اتنی دیر کہاں لگا دی اس نے بتایا کہ سید کی تلاش بے سود ثابت ہوئی ہے وہ اس کے پیچھے اچھی خاص بھاگ دوڑ کرتا رہا ہے اور سید گھر سے باہر کسی کام پر گیا ہے۔ ہم نے کہا اس صورت میں اسے ہمیں اطلاع کر دینی چاہیے تھی تا کہ ہمیں فضول انتظار نہ کرنا پڑتا۔ اس نے کہا کہ اس نے ایک آدمی کو ہمیں اطلاع دینے کے لیے بھیجا تو تھا۔ کیا اس نے آ کر ہمیں بتایا نہیں تھا کہ سید گھر پر نہیں ملا؟ وہ آدمی لیڈر کے تخیل کی پیداوار تھا۔ ایسی صریح دروغ بیانی پر کوئی اس سے

کیا کہتا۔ ہم چپکے ہو رہے لیکن ہم نے اصل بات بھانپ لی۔ سید نے اسے منہ نہیں لگایا تھا اور اس سے پستول خریدنے سے صاف انکار کر دیا تھا...... وہ اب خفیف ہو کر ہمارے پاس لوٹ آنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ شکست کھائے ہوئے کتے کی طرح دم کو ٹانگوں میں دبائے سمٹا سکڑا اور ٹوٹا ہوا۔

اس کی حالت قابل رحم اور عبرتناک تھی! کبھی کسی مہم کا لیڈر اپنے ساتھیوں کی نگاہ میں اس درجہ بے سا کز اور بے وقار نہ ہوا ہو گا۔ مجھے رابرٹ براؤننگ کی نظم ''کھویا ہوا لیڈر'' یاد آ گئی۔

چند چاندی کے سکوں کے عوض اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔

اپنے کوٹ میں ایک معمولی تمغہ لگانے کی خاطر وہ ہمارے دشمنوں سے جا ملا۔ لیکن یہاں حساب الٹ تھا۔ یہاں چھوڑنے والا لیڈر نہ تھا بلکہ لیڈر کے ساتھیوں نے اس کی لیڈر شپ سے روگردانی اختیار کر لی تھی۔ میں نے اس سے باتیں کر کے اسے بہلانے کی کوشش کی مگر پارٹی نے اس سے اس طرح آنکھیں پھر لیں جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔

تاریخ میں ایسے کئی لیڈروں کی مثالیں موجود ہیں جنھیں آخر میں ان کے اپنے ہی دوستوں نے ذلیل کیا اور تختہ دار پر کھینچا۔

ایک روپے والا آدمی

لڑکوں نے ڈمبل اور میرے لیے ایک کمرے میں بستر جما دیئے تھے اور کھانے کے کچھ دیر بعد ہم اس میں سونے کے لیے چلے گئے۔ یہ کمرہ کمرے سے زیادہ ایک چھولداری تھا۔ اور اس کی دو بیرونی دیواریں چکنے موم جامے کی قسم کے کپڑوں کی تھیں۔ دو چارپائیاں اس میں بمشکل سماتی تھیں اور کپڑے کی دیواریں سردی کے لیے کوئی روک نہ تھیں تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ ہوٹل کا بہترین کمرہ تھا۔ ہوٹل کے لڑکوں کا ہمارے ساتھ یہ امتیازی سلوک پارٹی کے سینے پر سانپ بن کر لوٹا۔ پارٹی اور معزول شدہ لیڈر کے لیے بستر باہر ایک بند برآمدے میں بچھائے گئے تھے۔

ہزاروی ایک آدھ گھنٹہ ہمارے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور اس طرح کم سے کم ہمارے سامنے اس کی شرمندگی دور ہو گی۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ ایبٹ آباد میں اس کا ایک چچا اور کئی ایک دوست رہتے ہیں جو بڑی خوشی اور آسانی سے اسے روپے ادھار دیں گے اور وہ ہمارے ساتھ اپنا حساب صاف کر دے گا'' اگر سید یہاں پر موجود ہوتا۔ اس نے کہا تو میں یہ پستول ڈھائی سو روپے کے عوض بیچ دیتا۔ اس کے بار بار کہنے پر میں اس کو پستول دینے کے لیے یہاں آیا ہوں لیکن وہ خود یہاں نہیں ہے۔ اب میرا اس میں کیا قصور ہے۔'' ہم نے اتفاق کیا کہ سید کی غیر حاضری کے لیے اسے قطعاً قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہزاروی اس حد تک اپنے رنگ میں

آ گیا کہ اس نے حقے کی چلم بجھ جانے کے بعد میرا پائپ ادھار مانگنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ اور اس نے پائپ یوں مزے لے لے کر پیا جیسے ہم تینوں دنیا بھر میں بہترین دوست ہوں اور ایک دوسرے کی چیزیں استعمال کرنے میں قطعی آزاد ہوں۔ اس کی باتوں میں پارٹی کے دوسرے ممبروں کے خلاف جسے وہ آڑھتی پارٹی کہتا تھا' رنج اور تلخی کا اظہار تھا۔ اسے ان کی کمینگی اور بے یقینی سے دکھ پہنچا تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے آج تک کسی کا ایک پیسہ نہیں رکھا بلکہ اس کے کئی ایک دوست تھی جن کی طرف اس کی سوسو روپے تک کی رقمیں نکلتی تھیں مگر اس نے کبھی ادائگی کے لیے انہیں نہیں کہا تھا۔ یہ دوستی کی اسپرٹ کے خلاف تھا۔ ہزاروی نے کہا "اور یہ تو رقم ہی معمولی ہے کل انیس بیس روپے۔ ایبٹ آباد میں اپنے چچ سے ادھار لے کر حساب صاف کر دوں گا۔ خواہ مخواہ ان آڑھتیوں کی ماں مر رہی ہے۔"

وہ انقلابی کے بارے میں ہمارے احساسات سے باخبر تھا اس لیے ہمیں خوش کرنے کی خاطر اس نے آڑھتی پارٹی کی کم ظرفی اور ندیدے پن کی کئی گھناؤنی باتیں بتائیں۔ مثلاً یہ کہ انقلابی نے بالاکوٹ میں ہزاروی سے میرے متعلق کہا تھا کہ میں ایس ڈی او وغیرہ نہیں تھا اور کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا تھا ہزاروی نے ناران میں انقلابی کی ایک اور خفیف حرکت بھی نوٹ کی تھی۔ اس نے مشترکہ کھاتے سے بے جا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو تین سیر دودھ منگوا کر پی لیا تھا۔ جس کی قیمت اسے الگ ادا کرنی چاہیے تھی۔ یوں تین سیر دودھ کی قیمت کا کچھ حصہ ہماری جیبوں میں سے گیا تھا۔ ہزاروی نے کہا کہ ہم وضع سے ہی خاندانی لوگ لگتے تھے مگر آڑھتی پارٹی کے چہرے سے ہی بخل اور بھوک ٹپکتی تھی۔ جیسے انہوں نے کبھی کوئی چیز نہ دیکھی ہو۔ ان سب باتوں نے ہمیں قدرے خوش کر دیا اور ہم نے ہزاروی کو پھر سے اپنے دل میں جگہ دے دی۔

ہزاروی سونے کے لیے چلا گیا۔ ڈمبل نے اپنی ڈائری میں اخراجات کا حساب کر کے مجھے بتایا کہ ہماری مالی حالت بڑی مخدوش ہو رہی ہے۔ اور ہمیں احتیاط سے خرچ کرنا چاہیے یہ بے حد غیر اغلب تھا کہ ایبٹ آباد پہنچ کر ہمارے پاس گھر پہنچنے کے لیے دو آدمیوں کا تھرڈ کلاس کا کرایہ بچ رہے۔ ہزاروی کے اخراجات اب بھی ہماری جیب سے جا رہے تھے اس اور اس کے شدومد سے کیے گئے وعدوں کے باوجود اس بات کی کوئی گارنٹی نہ تھی کہ وہ اپنے چچا سے روپے ادھار لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چچا جان کے کہیں باہر ہونے یا اپنے بھتیجے کو شناخت نہ کر سکنے کے امکانات کافی سے زیادہ تھے۔

حساب کے بعد ہم نے سونے کی تیاری کی۔ ڈمبل کو جلد ہی نیند آ گئی لیکن میں اس کاغانی ہوٹل کے موم جامے کی دو دیواروں والے کمرے میں دیر تک جاگتا رہا۔ کئی قسموں اور قوموں کے مچھر اور پسوں نے میر بستر کو ایک تڑپانے والا دوزخ بنا دیا لیکن وہاں کا بد

ترین عذب مکھیاں تھیں۔ مکھیاں وہاں ایسے اونچے مقام پر اور ایسے سرد موسم میں کیوں تھیں یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ بہرحال وہ وہاں موجود تھیں اور جھنڈوں میں بھنبھناتی ہوئی یلغار کرتی ہوئی نتھنوں اور کانوں میں گھسی پڑتی تھیں۔ کمبل کے نیچے آکر قمیض کے گلے یا آستین میں سے انسانی جلد تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈتی تھیں۔ ایک گھنٹے تک یہ سزا بھگتنے کے بعد میں نے سونے کی خواہش کو خیرباد کہہ دیا اور پائپ سلگا کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔

بڑی دیر تک میں پتھر کی مینڈھ پر ایک ٹانگ رکھے نیلی رات میں پائپ پیتا رہا...... اور ایسے ایسے سپنے دیکھتا رہا۔ جو اب سے پہلے کسی فانی انسان نے نہ دیکھے تھے۔ میں نے ایسی رات کبھی نہیں دیکھی' آسمان ایک غیر مرئی صیقل شدہ نیلے شیشے کی طرح شفاف اور چمکیلا تھا۔ چاند مچھلی پہاڑیوں سے نیزہ بھر اوپر چڑھ آیا تھا اور کنہار کی ہلکی غراہٹ کے سوا اس وسیع رات میں کوئی آواز نہ تھی۔ میں وہاں دو تین گھنٹے رہا اور میری محویت کو پلیٹوں اور دیگچیوں کی کھڑکھڑاہٹ نے توڑا ہوٹل کے لڑکے سحری کے لیے اٹھ چکے تھے۔

اس وقت میں ایک ملزم بچے کی طرح اپنے بستر میں سونے کے لیے چلا گیا مچھروں' پسوؤں اور مکھیوں کی دہشت کے باوجود۔

دوسرے دن پو پھٹتے ہی جیپ ہمارے لیے ہوٹل کے سامنے سڑک پر موجود تھی۔ ڈمبل اور میں نے اپنے بل کی ادائیگی الگ کی۔ آڑھتی پارٹی نے الگ (مشترکہ کھاتہ سسٹم ناران سے رخصت ہوتے وقت ہی منسوخ ہو چکا تھا) پھر ہمیں نے ہزاروی کا رات ٹھہرنے کا کرایہ بھی اس کی درخواست پر اپنے پلے سے ادا کر دیا۔ جیپ ہمارے سوا اور کوئی مسافر نہیں لے جا رہی تھی...... انقلابی نے جلدی سے جا کر فرنٹ سیٹ پر قبضہ کر لیا اس نے میری طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "تم ایس ڈی او ہو تو اپنے گھر میں ہو۔ فرنٹ سیٹ پر تو میں بیٹھا ہوں۔" اپنے زعم میں انقلابی لیڈر بنا بیٹھا تھا۔ ہم روانہ ہوئے اور ایک گھنٹے کی اترائی کے بعد پچھلے روز والے ہالٹ پر پہنچ کر بالاکوٹ سے آنے والی جیپوں کا انتظار کرنے لگے۔ پٹھان خانہ بدوشوں کا قافلہ ابھی تک وہیں ڈیرہ ڈالے پڑا تھا آڑھتی پارٹی ڈمبل کو اپنے ساتھ ایک طرف اہم مشاورت کے لیے لے گئی۔ ہزاروی ایک بستہ بردار کی طرح میرے گرد قدرے کھویا ہوا منڈلانے لگا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس مشاورت کا اس کی ذات سے تعلق ہے...... ناران سے ایک جیپ آئی اور ہمارا جرمن کوہ پیما اس میں سے اترا۔ میں اس کے متعلق کچھ جاننے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اور ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔

اس سے مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام فرانز ہان تھا۔ وہ آسٹرین جرمن تھا اور دوسری جنگ عظیم میں اس نے گورنگ کی "لفٹ وافے" میں ایک گراؤنڈ انجینئر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ نازی جرمنی کی شکست کے وقت وہ فرانس میں تھا۔ وہاں وہ امریکن فون کے

ہاتھ آ گیا اور جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ حسبِ سال اس نے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں گزارے رہائی پر اس نے اپنے وطن جانے کی جائے فرانس ہی میں رہائش کو ترجیح دی۔ وہ ایک ہوائی جہاز بنانے والی فرم میں اچھے ذمہ داری کے کام پر ملازم ہو گیا۔ اور اس نے ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کر لی۔ جب چند ماہ پہلے اسے ہندوستانی گورنمنٹ نے مدراس کے ایرونا ٹیکل کالج کے لیے لکچر شپ کی پیش کش کی تو اس نے اسے قبول کر لیا۔ اب وہ مدراس میں تھا۔ مگر وہ اپنی موجودہ ملازمت سے مطمئن نہ تھا۔ اس کو مدراس کی نہ تو آب وہوا پسند تھی اور نہ ہی وہاں کے لوگ۔ اور اس کی ملازمت اس کے لیے اپنی بیوی اور بچے سے پیہم جدائی کے مترادف تھی۔ فرانز ہاہن اپنی مدارس کی لکچر شپ سے خوش نہ تھا؟...... اس نے مجھے بتایا کہ اسے کوہ پیمائی کا زحد شوق ہے۔ کالج میں ان دنوں چھٹیاں تھیں اور وہ لاہور میں اپنے چند دوستوں کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ یہاں ایک نوجوان پاکستانی فوجی افسر نے اس سے وادی کاغان کی بے حد تریف کی تھی اور اس نے وادی میں کوہ پیمائی کا فیصلہ کر لیا۔ ہاہن نے وادی کو بہت پسند کیا تھا...... خاص طور پر وادی کے لوگوں کو جو اس نے کہا بڑے خوش اخلاق اور اچھے تھے۔

میں نے فرانز ہاہن سے پوچھا کہ کیا وہ سیف الملوک جھیل پر گیا تھا؟

''ہاں'' اس نے کہا ''میں نے ایک رات وہیں کیمپ کیا تھا'' پھر سا نے پوچھا کیا تم نے وہاں کیمپ کے نشان دیکھے تھے؟ جھیل کے جنوبی کونے پر؟ وہ میرا کیمپ تھا۔''

میں نے کہا کہ ہم نے کیمپ دیکھا تھا اور پتھر پر اس کے نام کے نیچے اپنے نام بھی کھودے تھے' وہ یہ سن کر بڑا خوش ہوا۔

میں نے اس سے اس کی عمر دریافت کی تو یہ جان کر حیران رہ گیا کہ وہ پچتالیس برس کا تھا۔ فرانز ہاہن انیس بیس سال کا ایک تازہ رو جوان لڑکا لگتا تھا۔ صحت مندانہ زندگی نے اس کے جسم اور دل کو بڑھا نہ ہونے دیا تھا۔

وادی میں وہ ناتا کونڈی میں سے ہوتا ہوا بابوسر پاس تک پا پیادہ گھوم آیا تھا۔ رات کو کھلی ہوا میں تاروں کے سائے تلے سوتا ہوا ...... بابوسر پاس پر اس نے قاتل نانگا پربت کی اپنے کیمرے سے کئی تصویریں لی تھیں جو اس نے مجھے دکھائیں۔

ڈاک بنگلے کے پرے برآمدے میں این ڈبلیو ایف پی کا بڑا افسر اور اس کی بیگم صاحبہ آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ صاحب ایک سرخ صحت مند نوجوان تھا۔ مگر بے رنگ اور تھکا ہوا۔ وہ ایک احمق مچھلی کی یاد دلاتا تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جن کے متعلق آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس لیے سفر کرتے ہیں۔ اس کے پاس اپنی بیوی کو کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا جو ایک لمبے چہرے اور تیکھے نقوش کی خوبصورت عورت تھی۔ ایک بچہ بھی انہیں دیکھ کر جان سکتا تھا کہ کافی عرصے کی شادی کے باوجود وہ اب تک ایک دوسرے کے لیے

مطلق اجنبی تھے...... ایسے جوڑے کم نہیں ہیں جنہیں دیکھ کر آدمی شادی کے خوفناک اور غیر قدرتی رواج پر تھرا اٹھتا ہے۔

بیریر کھل گیا' فرانز ہاہن اپنی جیپ میں بیٹھ کر بالاکوٹ روانہ ہوگیا۔ ہمارے جیب میں بیٹھنے سے پیشتر ڈمبل نے مجھے ''انقلابی ڈمبل بات چیت'' کے اہم نکات اور فیصلوں سے مطلع کیا۔ آڑھتی پارٹی نے ڈمبل سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ہزاروی کے ایبٹ آبادی چچا کا وجود بے حد مشکوک تھا اور حساب چکنے کی زیادہ امید نہ تھی۔ آڑھتی پارٹی نے ہمیں یہ جتایا تھا کہ ہزاروی کے پیسے نہ دینے کی صورت میں کل نقصان میں آدھا حصہ ہمیں برداشت کرنا پڑے گا (ناران تک خزانچی ہم سب کے لیے خرچ کرتا رہا تھا) ڈمبل یہ فیصلہ مان آیا تھا۔

میں اس سے لڑ پڑا ''تمہارا ارادہ یہ ہے کہ ہم ایبٹ آبادی میں پڑے بھیک مانگتے پھریں ہزاروی آڑھتی پارٹی کی دریافت تھا۔ اس کے لیے وہ ذمہ دار ہیں۔ میں آڑھتی پارٹی کو ایک پائی تک نہیں دوں گا۔''

ہم بیریئر سے روانہ ہونے اور ایک گھنٹے کے بعد' بالاکوٹ' اپنے عجیب پل اور دریا کے تیلے فیتے کے ساتھ نیچے ایک نقشے کی طرح پڑا تھا۔ یہ ایک نقشے کی طرح پڑا تھا۔ یہ ایک خوش اینڈ منظر تھا...... ہم ''تہذیب'' میں واپس آ گئے تھے۔

ہم بیریئر ہی پر اتر گئے۔ جیپ وہاں سے روانہ ہونے میں دیر کرتی معلوم ہوتی تھی اور شہر کا فاصلہ آدھ میل سے زیادہ نہ تھا اس لیے ہم نے پیدل چلنے کو ترجیح دی...... اس دن پیر فرتوت...... یا بالکل اسی قسم کا ایک اور بوڑھا (مجھے یقین ہے یہ وہی ہوگا) ابھی تک چٹانوں کے درمیان گندھک کے چشمے پر بیٹھا تھا...... بازار میں ہم فرانز ہاہن کو پل کی طرف آتے ہوئے ملے۔ وہ اپنے کیمرے سے مختلف نظاروں کی تصویریں اتار رہا تھا۔ ہاہن نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنا ٹکٹ خرید لیا ہے اور ایبٹ آباد کی بس چلنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔

ہم نے اپنے ٹکٹ خریدے اور طوعاً و کرہاً ہم کو ہزاروی کے بھی ٹکٹ خریدنے پڑے ڈمبل اور میرے پانے گھر پہنچ سکنے کے امکانات اب بالکل سکڑ گئے تھے اور ان کا انحصار اب کلیتاً ہزاروی کے ایبٹ آبادی چچا پر تھے۔ ادھر ڈمبل نے ''انقلابی ڈمبل بات چیت'' میں ہزاروی کے پانے اخراجات کی عدم ادائیگی کی صورت میں آدھے خرچ میں شرکت کے اصول پر صاد کر دیا تھا۔ ہماری حالت نا قابل رشک تھی ہم نے اپنی تباہی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا مگر ایک شتر مرغانہ فریب خوردگی سے کام لے کر اپنی گردنوں کو ریت میں چھپا لیا۔ (جسمانی ہیئت میں ڈمبل تو نہیں میں کسی قدر اس اوٹ پٹانگ افریقی جانور سے مشابہت رکھتا ہوں اور میرے دوست اکثر اس مشابہت کے سلسلے میں میری یاد دہانی کراتے رہتے ہیں)

کوئی تین بجے ہم بالاکوٹ سے روانہ ہوئے...... یہ کلبلاتے شوریدہ دریا اور لکڑی کے شکستہ پل کا پرتو صیر شہر جو تاریخ میں اسمعیل شہید کی وجہ سے مشہور ہے (مجھے یاد ہے ہمارے ان گنت اسلامی تاریخی ناول نویسوں میں سے ایک نے شاید بالاکوٹ کے نام سے ایک ناول لکھا ہے جس کے ساڑھے آٹھ سو صفحات ہیں) اسمعیل شہید ایک بہادر آدمی تھا۔ اس نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ہمراہ ان پہاڑیوں میں کئی ماہ پوری سکھ طاقت کا مقابلہ کیا۔ وہ یہاں شہید ہو گیا۔ اپنے عقیدے اور اپنے ایمان کے لیے جان دینے سے کون سی چیز بہتر ہو سکتی ہے اس طرح صرف بے حد بہادر لوگ ہی مر سکتے ہیں ورنہ اسلامی تاریخی ناول تو ہر کوئی لکھ سکتا ہے۔

میں فرانز ہاہن کے ساتھ بیٹھا اور تقریباً سارے راستے اس سے باتیں کرتا رہا۔ انقلابی میرے بازو کی سیٹ سے پچھلی نشست پر بیٹھا مجھے حاسد نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسے ایک گورے سے میرا باتیں کرنا پسند نہ آیا وہ...... ناران کے غاری ہوٹل ناشیر میں اب اپنے دم خوم پنجے اور دانت کھو چکا تھا۔ انقلابی اور میں ساری مہم کے دوران چوری چھپے ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہے۔ اس کی نفرت اس وقت شروع ہوئی تھی جب میں نے بالاکوٹ سے روانگی کے وقت سگرٹ نہیں خریدے تھے۔ مجھے وہ غالباً اس لیے ناپسند تھا کہ وہ بے حد شیخی خورہ تھا اور خود کو بڑا آزاد خیال اور انقلاب پسند سمجھتا تھا۔ ان لوگوں سے میری قطعی نہیں بنتی جو ہمہ وقت اپنی دھاک بٹھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

ہزاروی اور ڈمبل پیچھے بیٹھے تھے۔ ہزاروی تھوڑی دیر کے بعد میرا پائپ ادھار مانگتا۔ اس کی بے وقری اب قطعی نمایاں ہو چکی تھی۔ اب وہ پیشہ ور کاسہ لیس کے روپ میں نمودار ہو چلا تھا۔ میں اب بھی اسے پسند کرتا تھا۔ آخر وہ ہمارے کیمپ میں تھا۔ اور انقلابی دوسرے دشمن کے کیمپ میں ڈمبل چپ چاپ اور کھویا کھویا سا لگ رہا تھا وہ غالباً ہماری مالی حالت کے بارے میں متفکر تھا۔ اگر ہم کو ہزاروی کے اخراجات کا آدھا حصہ دینا پڑا تو کیا ہمارے پاس لاہور پہنچنے کا تھرڈ کلاس کا کرایہ بچ رہے گا۔ ہمارے دیوالیہ ہونے کے ذمہ دار انقلابی اور اس کا ساتھی تھے۔ انقلابی نے ناران کے ہوٹل میں دودھ اور چائے کے خم کے خم بڑی فیاضی سے لنڈھائے تھے اور مرغ قورمے سے اپنی جان بنانے کی کوشش کی تھی پھر ہزارے کا آدمی دراصل ان کی دریافت تھا۔ اور انہی کی وجہ سے ہم نے اسے پارٹی کے فردکی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ آڑھتی پارٹی کا ہزاروی کے آدھے اخراجات کی آدھی رقم ہمارے سر پر ڈالنا ان کی کمینگی کا بین ثبوت ہے!

ہاہن اب چپ تھا۔ بس اس اذیت وہ بے آب و گیاہ چٹنی گھاٹی میں رینگتی ہر ہیں۔ افسردگی اور خوف کے بادل تہہ در تہہ مجھ پر چھانے لگے۔ جب ہم کاغان جانے کے لیے نیلی میں بیٹھے تھے تو ہمارے دل گا رہے تھے۔ ہم راکھشسوں اور بھوتوں سے بھاگ کر

آزادی اور نامعلوم ایڈونچر کی سمت جا رہے تھے...... اونچے پہاڑوں اور وسیع جگہوں کی سمت جہاں سے ضروری نہ تھا کہ ہم لوٹیں!
......اور اب...... اب ہم گھر کو لوٹ رہے تھے۔ دم گھونٹنے والے گھر' دفتر کا بے روح کام' ٹھٹھا اڑاتے ہوئے راکھشس جہاں ہمارے منتظر تھے۔ تم ہم سے نہیں بچ سکتے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ تم ہزار بھاگو اور چھپو' کاغان کی برفوں میں یا اجنتا کے غاروں میں یا لکا دیو کے جزیروں میں۔ تم پھر یہیں آؤ گے اور ہم تم کو کچل دیں گے' آخر میں ہم تم کو مار ڈالیں گے' تم ہم سے نہیں بچ سکتے...... ہاہاہاہا

''بے وقوف'' میں نے اپنے سے کہا ''تم واپس کیوں جا رہے ہو؟ کیا تم مرنا چاہتے ہو؟''

میں جانتا ہوں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے لیے سفر کا بہترین لمحہ وہ ہوتا ہے۔ جب وہ واپس اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں۔ میں ان سے سراسر مختلف ہوں۔ چھت کے نیچے میرا سانس گھٹتا ہے اور کبھی اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا گھر سے دور کھلی سڑک پر' اور چھلکے ہوئے تاروں کے نیچے میں اپنے دل میں ایک خانہ بدوش ہوں' اور گھر اور دفتر کی مہذب رسمی زندگی مجھے زنداں کی پر اذیت قید لگتی ہے' میں جانتا ہوں اس زندگی نے بہت سوں کو مار دیا ہے اور ہمارے گونجتے ہوئے شہر ان رینگتی ہوں لاشوں سے پر ہیں۔ میں خود کو باغی سمجھنا پسند کرتا ہوں اور شاید حقیقت میں محض ایک بزدل شخص ہوں جو دنیا کی حقیقتوں سے بھاگتے رہنے میں اپنی عافیت دیکھتا ہے۔

اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا دینے کے لے میں نے چپکے سے اسٹیونس کی ''ویگا بانڈ'' کے وہ بند دوہرائے جو میری زندگی کے مسلک کا (اگر میرا کوئی مسلک ہے) اظہار کرتے ہیں۔

مجھے اس قسم کی زندگی دو جس سے میں محبت کرتا ہوں
ایک کھلی سڑک پاؤں تلے ہو۔

اور نیلا آسمان سر پر
شہرت کی مجھے تمنا نہیں نہ ہی آس اور محبت کی۔
نہ ہی اس بات کی کہ کوئی مجھے جانتا ہو۔
جھاڑی میں پر ابستر ہو جہاں سے میں تاروں کو دیکھ سکوں۔
روٹی کا ٹکڑا جسے میں دریا کے پانی میں ڈبو کر کھاؤں
میرے جیسے آدمی کے لیے یہی زندگی ہے۔
ہمیشہ کے لیے یہی زندگی

اور پھر میں سوچنے لگا کیا ایسی زندگی ممکن ہے۔ کیا آدمی ایک ''ویگابانڈ'' یا خانہ بدوش کی طرح اس جدید مشینی دور میں رہ سکتا ہے۔ آدمی کے لیے کسی طور روٹی کمانا ان ضروری ہے۔ امریکی فلسفی تھوریو) ایسے شخص کا مادہ پرست امریکہ میں پیدا ہونا معجزہ ہے) اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ خدا کی زمین پر خود کو روٹی کپڑا مہیا کرنا آدمی کے لیے مصیبت نہیں بلکہ محض جی بہلاوا ہے بشرطیکہ ہم سادگی سے اور دانائی سے زندگی بسر کریں۔ ایک مچھندر اپنے ناچنے والے ریچھ سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال لیتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کو اپنے پر لطف کرتب اور اپنے گرد بچوں کی ہنسی میں وہ خوشی نہیں ملتی جو امیر آدمی اپنے فرجیڈ یر اور اپنی موٹر کار سے بھی حاصل نہیں کر پاتا۔ انگریزی شاعر آلیور گولڈسمتھ (جس نے وہ چھوٹی سی خوبصورت کلاسیک ''وکار آف ویکفلیڈ'' لکھی ہے) دو سال تک ایک آوارہ گرد گویے کے روپ میں یورپ کی سڑکوں پر پھرتا رہا...... بنسری بجا کر اپنا پیٹ پالتا اور سرراہ کی چھوٹی سراؤں میں سوتا۔ کیا یہ ایک بینک منیجر سے بہت زندگی نہ تھی۔

مگر تھوریوں کی مثال کلاسک ہے۔ اپنے اس فلسفے کو آزمانے کے لیے اٹھائیس سال کی عمر میں کل پانچ پاؤنڈ کے سرمایے اور ایک مانگے ہوئے کلہاڑے کے ساتھ وہ والڈن کے جوہڑ پر اگے ہوئے جنگل میں آیا اور اس نے اپنی زندگی کا نیا تجربہ شروع کیا۔ اس نے اپنے رہنے کے لیے لکڑی کی چھوٹی سی جھونپڑی بنائی اور کلہاڑا اس ہمسائے کو واپس کر دیا جس سے اس نے ادھار لیا تھا۔ پھر اس نے جوہڑ کے کنارے زمین کے ایک ٹکڑے کو درست کیا اور اس میں پھلیاں اور مٹر' آلو اور اناج کی کاشت کی۔ وہ اپنی روٹی خود پکاتا۔ اس کے باوجود اس کے پاس بڑا وقت بچ جاتا۔ وہ سبز درختوں میں تن تنہا لمبی سیروں پر نکل جاتا اور جنگل کی مخلوقات کو دوست بناتا۔ پانچ سال وہ اس طرح رہا اور اس چھوٹے سے جوہڑ پر جیسی سچی اور توانا زندگی اس نے گزاری اس پر بادشاہ بھی رشک کر سکتے ہیں ...... قدرت کے ساتھ ہم آہنگی سے جینا بڑی خوش بختی ہے۔ زمین کو کھودنا اس میں سہاگہ پھیرنا' ہل چلانا' درانتی سے کاٹنا' بھیڑوں کو چرانا۔ اناج پکنے پر اسے چھاج سے پھٹکنا' گلہریوں اور خرگوشوں اور خدا کی چھوٹی بڑی مخلوق کو حیرت اور مسرت سے دیکھنا دن کو کے سے نور میں سے ابھرتے اور گلاب اور عنبر کے مخمل میں ڈوبتے ہوئے تکنا موسموں کے بغیر تبدیل سے پورے حواس سے آگاہ ہونا۔ تند دریا میں ڈولتے ہوئے نوکے میں بھٹیالی گانا...... یہی اصل اور سچی زندگی ہے۔ ہم ناخوش اور دہشت زدہ اور سہمے ہوئے اسی لیے تو ہیں کہ ہم نے پوتر دھرتی سے اپنا واسطہ کھو دیا ہے اور چھوٹے ارمصنوعی آدرشوں کے پیچھے بھاگ نکلے ہیں۔

اس طرح کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے۔ میرا دل اس زندگی کے بارے میں سوچ سوچ کر سہا جا رہا تھا جو میرا انتظار کر رہی تھی۔ اوڈر کے ساتھ ساتھ اس میں ایک دمک بھی تھی۔ سیف الملوک کی برفانی جھیل۔ وہ نچے سبز پوش پہاڑوں اور تاروں سے

جھکے ہوئے آسمان اور وسیع نیلی راتوں کی دمک میں جانتا تھا یہ دمک اس وقت بھی ہوگی جب مجھے آخری بلاوا آئے گا اور ہم اس سب کچھ سے رخصت ہونے پر مجبور ہوں گے۔ یہ دمک گھر کی چار دیواری اور دفتر کی میز پر بھی میری رفیق ہوگی اور مایوسی وغم کی گھٹاؤں میں مجھے قوت دے گی۔

ہاہن کہہ رہا تھا" مجھے رات ایبٹ آباد میں ٹھہرنا پڑے گا' کیا تم مجھے کسی ہوٹل کا پتہ بتا سکتے ہو؟"

میں نے فلاش مین' کا نام لیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ایبٹ آباد میں وہی ایک پاس ہوٹل تھا۔ جس میں یورپین ٹھہر سکتے تھے۔ محتاط ہاہن نے پوچھا" اس کے چارجز کیا ہیں؟"

میں نے کہا" غالباً پچیس تیس روپے روز۔ ایبٹ آباد میں وہی ایک ہوٹل ہے جہاں تم ٹھہر سکتے ہو۔"

وہ تذبذب میں تھا" یہ بہت مہنگا ہے' مجھے کسی سستے ہوٹل کا پتہ بتاؤ۔"

میں نے اسی ہوٹل کا پتہ بتایا۔ جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ ساتھ ہی اسے مشورہ دیا کہ وہ وہاں نہ ٹھہرے اور اسکے لیے واحد جگہ فلاش مین ہی ہے صاف اور ستھری۔

یا تو ہاہن بڑا کنجوس اور کفایت شعار تھا یا ہماری طرح اس کی جیب بھی خالی ہو چکی تھی اور وہ اپنے پیسوں کو ہوشیاری سے خرچ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک سستے ہوٹل میں رات بسر کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"سونے کو تو میں کہیں بھی سو سکتا ہوں' مجھے ایک اچھے غسل کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ پچھلے پندرہ دن سے میں صابن سے نہیں نہایا مگر میں ایک رات کے قیام پر پچیس روپے خرچ نہیں کر سکتا۔"

وہ پندرہ دن سے نہیں نہایا تھا اور اس کے باوجود صاف اور اجلا اور تازہ دم لگتا ہے۔

میں نے ڈمبل سے کہا" ہم کو بھی رات ایبٹ آباد میں ٹھہرنا پڑے گا۔" اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" ڈمبل نے کہا" ہم دیوالیے ہو چکے ہیں۔ ہم رات کو حویلیاں سے گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔"

میں بھی ایبٹ آباد میں نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ انقلابی کی صحبت میں مزید وقت گزارنے کا خیال میرے لیے سوہان روح تھا اور شکر ہے ہماری جیب بھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

سلیٹی شام کے جھٹپٹے میں ہم ایبٹ آباد میں داخل ہوئے۔ ہماری بس اسی جگہ رکی۔ جہاں سے ہم دونوں پہلی اس میں سوار ہوئے تھے۔ سب مسافر اترے میں نے دیکھا کہ انقلابی اور خزانچی محافظ فرشتوں کی طرح ہماری رکھوالی کر رہے تھے۔ انہیں ابھی ہم

سے ہزاروی کے اخراجات کا معاملہ طے کرنا تھا۔ فرانزہان نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنے تھیلوں اور کیمروں سے لدا ہوا بازار میں اپنے رات کے ٹھکانے کی تلاش میں چل پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ فلیش حسین میں نہیں ٹھہرا ہوگا وہ صحیح معنوں میں ٹورسٹ تھا۔ اور اگر وہ کہیں نہا سکتا تو شاید رات باہر سڑک پر اپنے سونے کے تھیلے ہی میں گزار لیتا۔

ہم پہلے اسی بالانشینوں والے ہوٹل میں گئے جہاں ہم نے ایک یادگار رات گزاری تھی اور گھوڑے کے حملے سے بال بال بچ چکے تھے۔ وہ آخری جگہ تھی جہاں ہم جاتے۔ مگر انقلابی اور خزانچی کا رات کو وہاں ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ گول مٹول پھل فروش ہمیں ہوٹل سے کچھ ادھر ہی مل گیا اور ہمارے کاغان سے اتنی جلدی واپس آنے پر حیرت زدہ ہوا اس نے آڑھتی پارٹی کو اپنے ٹھہرنے کی دعوت دی (یا تو وہ بے حد مہمان نواز تھا اور یا آڑھتی پارٹی سے اس کے کوئی کاروباری تعلقات تھے) جسے انقلابی نے قبول نہ کیا۔ بعض اوقات انقلابی ضرورت سے زیادہ غیرت اور حمیت کا مظاہرہ کرتا تھا جو دوسروں کے سگرٹ پھونکنے پر رخصت ہو جاتی تھی۔

ہوٹل میں انہوں نے اپنا سامان رکھوایا اور کچھ دیر ہم اس کے تنگ و تاریک چائے خانے میں بیٹھے مہم کے لیڈر ہزاروی پر دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ اپنے اخرجات کا حصہ جو اٹھارہ روپے بنتا تھا ادا کردے۔ انقلابی نے اسے کافی جلی کٹی سنائیں۔ ہزاروی نے کہا کہ وہ اپنے چچا سے جا کر یہ رقم لے آئے گا۔ انقلابی کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس لیے ہم سب ہزاروی کے ساتھ اس کے چچا کے مکان کی طرف چلے۔ انقلابی نے کہا کہ اسے یقین ہے کہ ہزاروی کا ارادہ ہمیں جل دینے کا ہے اور وہ ہمیں بنا رہا ہے۔

ہزاروی ہمیں ایک تنگ اندھیری گلی میں لے گیا۔ ہم گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوگئے اور ہزاروی نے ایک حویلی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس حویلی کے اندر سے درختوں کی خوشبو آرہی تھی۔ کوئی اندر سے نہ نکلا اس نے پھر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک منڈے سروالا کوزہ پشت آدمی باہر آیا۔ اس نے ہزاروی سے ہاتھ ملایا بلکہ یوں کہنا چاہیے۔ کہ ہاتھ ہزاروی نے ملایا اور کوزہ پشت نے صرف اتنا کیا کہ اپنا ہاتھ ہزاروی کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ ہزاروی کو دیکھ کر چنداں خوش نہیں لگتا تھا۔ اتنی دور سے ہم یہ نہ سن سکے کہ ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی ہزاروی التجائیں کرتا لگتا تھا مگر کوزہ پشت پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک دفعہ ہم نے ہزاروی کو کوٹ کے اندر سے پستول نکالتے اور کوزہ پشت کی طرف بڑھاتے ہوئے دیکھا مگر کوزہ پشت نے زور زور سے اپنا سر انکار میں ہلا دیا۔

انقلابی نے کہا "مجھے یقین ہے یہ شخص ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو جائے گا۔ جب سے ہمارے ساتھ آکر چمٹا تھا۔ میں بھانپ گیا تھا کہ یہ کوئی اچکا ہے۔"

آٹھ گھنٹے کے بعد ہزاروی لوٹا۔ نامرادی اس کے چہرے پر چھاپے کی طرف لکھی ہوئی تھی۔ اور اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے

ہمیں اطلاع دی کہ اس کا چچا آج ہی لنڈی کوتل گیا ہے اور دو تین دن تک آئے گا۔ انقلابی نے جو گئی لپٹی رکھنے کا عادی نہ تھا اس کو ایسی باتیں سنائیں کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی کسی کو ایسی باتیں سنا سکتا ہے۔

ہزاروی کی بے وقری اب مکمل تھی لیکن ہمیں اپنی مالی پوزیشن کی فکر تھی۔ ہزاروی کے مشن کی ناکامی کا مطلب یہ تھا کہ ہزاروی کے حصے کے تو روپے ہمیں پورا کرنے ہوں گے۔ یہاں سے ہم سب بس کے اڈے کی طرف چلے۔ جہاں ہمیں حویلیاں جانے والی بس میں بیٹھنا تھا۔ ہزاروی نے بہترا کہا کہ وہ چند دنوں تک حیدر آباد اپنے بھائی سے ملنے جا رہا ہے اور راستے میں سرگودھا میں اتر کر آڑھتی پارٹی کا حساب چکا دے گا۔ لیکن آڑھتی پارٹی نے اس سے کہا کہ وہ اسے وہاں نہیں دیکھنا چاہتے۔

ہم بس کے اڈے پر پہنچے۔ یہاں بہت کم لوگ تھے۔ چاند اب نکل آیا تھا اور ارد گرد کی درختوں سے ڈھنپی پہاڑیاں پراسرار لگتی تھیں۔ حویلیاں کو جانے والی بس کے چلنے میں ابھی دیر تھی۔ ہم ایک خالی بس میں بیٹھ گئے' آڑھتی پارٹی نے اب ہزاروی سے بات چیت بالکل بند کر دی اور ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ دوبارہ بس کے اوذ حساب ہوا۔ انقلابی نے کہا کہ ہزاروی کے اخرجات کا آدھا حصہ ہم دیں۔ ڈمبل نے انہیں ٹالنے کی کافی کوش کی۔ ہم یہ رقم دے دیتے' مگر ہمیں پتہ نہیں تھا کہ دینے دلانے کے بعد ہمارے پاس لاہور پہنچنے کا تھرڈ کلاس کا کرایہ بھی بچے گا یا نہیں۔ آڑھتی پارٹی کے سامنے اس مشکل کی وضاحت کی گئی۔ میں نے یہاں تک کہا کہ ہم گھر پہنچتے ہی یہ رقم انہیں بذریعہ منی آرڈر بھجوا دیں گے (ویسے ہمارا اس قسم کا کوئی ارادہ نہ تھا) مگر انقلابی کافی کائیاں آدمی تھا' بالکل نہ مانا۔ وہ ان آدمیوں میں سے تھا جو اس مقولے پر یقین رکھتے ہیں کہ ہاتھ میں آیا ہوا ایک پرندہ جھاڑی میں بیٹھے ہوئے دو پرندوں کے مساوی ہے۔

ہزاروی نے پھر قسم کھائی کہ وہ تین دن میں سرگودھا رقم لے کر پہنچ جائے گا۔ اور اچانک اس نے کوٹ کے نادر سے اپنا پستول نکال کر انقلابی کی گود میں ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ اسے بوطر ضمانت رکھ لے۔ انقلابی اپنی مجاہدانہ اور خونخوار گفتگو کے باوجد چوزہ دل شخص تھا اور ہتھیاروں وغیرہ سے خائف۔ وہ اپنی بس کی نشست سے اس طرح اچھلا جیسے بچھو نے اسے ڈنک مارا ہو۔ وہ پستو کو مرے ہوئے چوہے کی طرح جھاڑ کر فوراً بس سے باہر نکل آیا۔

"جاؤ جاؤ یہ چار سو بیسی کسی اور سے کرو ہم کو کیا پتہ کہ تم کون ہو۔ میں لائسنس کے بغیر یہ پستول کیسے رکھ سکتا ہوں' تمہارا مطلب ہمیں پکڑوانے کا ہے۔ اس کو اٹھا لے جاؤ۔" انقلابی سخت غصے میں تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ پستول باہر پھینک دوں کیونکہ ہزاروی کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ اسے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ ابھی کسی پولیس والے کو لا کر ہمیں پکڑا دے۔

ہزاروی نے جھینپ کر پستول اٹھالیا اور قسمیں کھائیں کہ اس نے پستول بطور ضمانت پیش کیا تھا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہزاروی کے حصے کے نو دس روپے دینے میں ہماری لیت و لعل اس وجہ سے نہ تھی کہ ہم آڑھتی پارٹی بلکہ انقلابی کی خست اور کمینگی میں اس کی برابری کے خواہشمند تھے۔ بلکہ محض اس لیے کہ ایبٹ آباد میں ''سٹرینڈ'' ہو کر رہ جانا خوشگوار بات نہ تھی۔ واحد شخص جس سے غالباً ہم ادھار لے سکتے تھے کاکول اکادمی میں میرے خالو کے داماد کا چھوٹا بھائی تھا اور ہم بعض وجوہ سے یہ نہیں کرنا چاہتے تھے (اس سے یکا بہت بڑا اسکنڈل پیدا ہونے کا امکان تھا' ہم نے آخر نو روپے آڑھتی پارٹی کو دے کر اپنی جان چھڑائی اور وہ بھی پیسے جیب میں ڈال کر اور ہم کو ہزاروی کی مزید صفات سے آگاہ کر کے چلتے بنے۔

مگر ہزروی اسی طرح منڈلاتا رہا۔ آڑھتی پارٹی کے جانے کے بعد اس نے مجھ سے سگریٹ مانگ کر سلگایا اور کہا کہ میں اس کے پستول کو اپنے پاس بطور ''یادگیری رکھ لوں'' پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ انے ہمیں خوش خبری دی کہ وہ ایک ہفتے تک حیدر آباد جاتے ہوئے لاہور میں اترے گا اور ہمیں ملے گا۔

''اگلی دفعہ آپ کاغان آنے کا ارادہ کریں تو مجھے ضرر خط لکھ دیں۔ میرے سید دوست کے پاس اپنی کار ہے۔ ہم ایبٹ آباد سے اکٹھے اس کی کار میں کاغان جائیں گے۔ اور اسی کے پاس ٹھہریں گے۔ وہ ہماری بڑی خاطر کرے گا۔''

وہ اس طرح کی باتیں کرتا رہا' اور بس چلنے سے تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھ سے کہا کہ میں ذرا نیچے اتر کر اس کی بات سن لوں۔ میں نیچے اترا' وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی اور التجا کے لہجے میں اس نے مجھ سے ایک روپیہ مانگا۔

میں نے کچھ سوچ کر اسے ایک روپیہ دے دیا جسے اس نے فوراً جیب میں ڈال لیا۔ اور آخری السلام علیکم کہہ کر چل دیا۔ میں نے اسے گھسٹتے ہوئے قدموں سے اڈے سے جاتے اور جھاڑیوں میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

اس کی جیب میں دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک روپیہ تھا اور کوٹ کے اندر چھپا ہوا ایک پستول جس کی کسی کو ضرورت نہ تھی۔ وہ محض اپنے ذہن کی مدد سے زندہ تھا۔ ایک ایسا بدمعاش جو محبت کرنے کے لائق تھا۔ میرا دل اس کے لیے بھر آیا۔

◆◆◆